نصرۃ میگزین

شعبان۔رمضان 1443ھ | مارچ–اپریل 2022ء

شمارہ-65

ریاست اور معاشرے کی تقسیم

اسلامی ریاست، کفر بواح اور دار الکفر

بیوی کیلئے شوہر کی اطاعت کا ثواب مرد کی شہادت کے برابر ہے

اِن حکمرانوں سے نجات کے لیے دوبارہ نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت قائم کرو، جو ہمیں تباہ کن مغربی عالمی آرڈر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں

فہرست

اداریہ 3

تفسیر سورۃ البقرۃ۔(224-225) 5

قرآنِ مجید زبان دانی کا معجزہ ہے جو نبی محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کرتا ہے 10

حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ 33

یقیناً خالد بن ولید ؓ مسلم فوجی افسران کے لیے ایک نمونہ اور مثال ہیں کہ کس طرح انہوں نے عظیم دینِ اسلام اور اس کی معزز امت کا ساتھ دیا . 40

بیوی کیلئے شوہر کی اطاعت کا ثواب مرد کی شہادت کے برابر ہے 49

ریاست اور معاشرے کی تقسیم 64

اسلامی ریاست، کفر یواح اور دار الکفر 68

اِن حکمرانوں سے نجات کے لیے دوبارہ نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت قائم کرو، جو ہمیں تباہ کن مغربی عالمی آرڈر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں 85

سائنس اور سائنسی طریقہ کار 89

سوال وجواب: دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی کا قاعدہ 99

سوال وجواب: جن معاملات پر شریعت خاموش ہے 105

سوال وجواب: عوامی آگہی سے جنم لیتی ہوئی رائے عامہ 121

میڈیا سرگرمیاں 130

سوشل میڈیا معلومات 131

اداریہ

پاکستان کو آج صرف سیاسی قیادت کے ہی بحران کا سامنا نہیں، جب مسلمان "قیادت کے فقدان" پر افسوس کرتے نظر آتے ہیں، بلکہ اسے نظریاتی قیادت کے بحران کا بھی سامنا ہے، جہاں مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ حکمرانی، نظام اور نظم و نسق ناکام ہو چکے ہیں۔ سوال صرف یہ نہیں ہے کہ "کس کی حکومت" ہونی چاہیے بلکہ سوال یہ ہے کہ "کس بنیاد پر" حکمرانی استوار ہونی چاہیے۔ یہ صرف شناخت کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک مفصل، نظریاتی عالمی نقطۂ نظر کا معاملہ ہے۔

پاکستان مسلم دنیا میں نظریاتی بحران کا سامنا کرنے میں اکیلا اور منفرد نہیں ہے۔ 28 رجب 1342 ہجری بمطابق 3 مارچ 1924 کو خلافت کے خاتمے کے بعد سے، مسلم امت ایک ایسے آئین کے بغیر زندگی گزار رہی ہے جو قرآنِ کریم اور سنتِ مبارکہ سے ماخوذ ہو۔ اس کے بعد سے، مسلم دنیا پر آمریت، بادشاہت، صدارتی جمہوریت اور پارلیمانی جمہوریت کے ملغوبوں کے ذریعے حکومت کی گئی ہے۔ تاہم مسلمان بدستور معاشی بدحالی اور اپنی سلامتی کے حوالے سے ذلت و رسوائی میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ اپنی سمت واضح نہ ہونے کی وجہ سے مراکش سے انڈونیشیا تک مسلم دنیا پر بدامنی حاوی ہے۔

مارچ 1940 کی قراردادِ لاہور واضح طور پر اس حد تک آگے نہ بڑھ سکی کہ جو نظریہ کے اس بحران کو حل کرنے کے لیے درکار ہے۔ 23 مارچ 1956 کو پاکستان کے پہلے آئین نے مسلمانوں کے لیے ایک وطن کے پہلو پر زور دیتے ہوئے برطانوی ولی عہد کے اقتدار سے صدارتی جمہوریت کی طرف منتقلی کا نشان لگایا۔ تاہم نظریے کا بحران برقرار رہا۔ 1973 کے آئین میں بھی نظریے کے معاملے پر توجہ نہیں دی گئی۔ اس نے محض فوجی بالادستی کے مقابلے میں سویلین بالادستی کے توازن کو صدارتی جمہوریت سے پارلیمانی جمہوریت میں تبدیلی کے ذریعے بدل دیا۔

پاکستان کا نظریاتی بحران چیف ایگزیکٹیو کی شناخت کے مسلمان، سویلین یا فوجی افسر ہونے سے حل نہیں ہو گا۔ اس بحران کا حل آئین کی اصل اور بنیاد کو مخاطب کرنے سے ہی حل ہو سکتا ہے۔ بحران کا حل کسی ایسے آئین سے نہیں ہو سکتا جو مکمل طور پر یا جزوی طور پر ان قوانین سے اخذ کیا گیا ہو جو انسانوں کے طے کردہ ہیں۔ ستر سال سے زائد عرصے گزر جانے کے بعد پاکستان کے حالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

پاکستان کا نظریاتی بحران ایک ایسے آئین کو اپنا کر ہی حل کیا جا سکتا ہے جس کی ہر شق کی جڑیں قرآن مجید اور سنت نبوی ﷺ میں موجود ہوں۔ حزب التحریر نے ایک ایسا آئین تیار کیا ہے، جو چودہ سو سال قبل شروع ہونے والی بھرپور اسلامی فقہی روایت پر مبنی ہے۔ یہی وہ آئین ہے جسے اب نظریاتی بحران کے خاتمے کے لیے عوامی بحث اور نجی مطالعے کا مرکز بننا چاہیے۔ یہی ایک ایسی بحث اور مطالعہ ہے جو دستور کو اپنانے کیلئے نبوت کے طریقے پر خلافت کے قیام کی طرف ایک عملی، اور بنیادی طور پر اہم کردار ادا کرے گا۔

فہرست

تفسیر سورۃ البقرۃ۔(224-225)

جلیل قدر عالم دین شیخ عطاء بن خلیل ابو الرشتہ کی کتاب "التیسیر فی اصول التفسیر" سے اقتباس

﴿وَلاَ تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (224)لاَ يُؤَاخِذُكُمْ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ (225)﴾

"اور اللہ تعالیٰ (کے نام) کو اپنی قسموں میں اس غرض سے استعمال نہ کرو کہ اس کے ذریعے نیکی اور تقویٰ کے کاموں اور لوگوں کے درمیان صلح صفائی کرانے سے بچ سکو۔ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ اللہ تمہاری لغو قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرے گا، البتہ جو قسمیں تم نے اپنے دِلوں کے ارادے سے کھائی ہوں گی ان پر گرفت کرے گا۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، بڑا بُردبار ہے"۔

متعدد احکامات کے بیان کے ضمن میں اللہ تعالیٰ مندرجہ ذیل آیات میں بیان فرماتے ہیں:

1- اللہ سبحانہ وتعالیٰ اس بات سے منع فرماتے ہیں کہ کوئی شخص خیر کے کسی کام کو نہ کرنے کی قسم کھائے، اور اس کارِ خیر کے نہ کرنے میں قسم نہ توڑنے کو ایک بہانہ اور حجت بنالے، یہ سوچ کر کہ اب اس قسم کو پورا کرنا واجب ہے ورنہ اللہ کی نافرمانی ہو گی۔

نیز اللہ سبحانہ وتعالیٰ بیان فرماتے ہیں کہ اس طرح کی قسم اٹھانا درست نہیں جو نیکی، تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی سے روکے، بلکہ قسم کھانے والے کو چاہیے کہ وہ خیر کا وہ کام کرکے اپنی قسم کا کفارہ ادا کرے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **من حلف على يمين فرأى غيرها خيرا منها فليكفر عن يمينه ويفعل الذي هو خير** "جس نے (کسی کام کی) قسم کھائی، پھر اس کام کے علاوہ کوئی اور کام اُسے بہتر لگا، تو وہ اپنی قسم کا کفارہ دے اور وہ کام کرے جو بہتر ہے" (مسلم: 3113، ابن حبان: 10/196)۔

الکلبی نے روایت کیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب انہوں نے قسم کھائی کہ وہ اپنے داماد بشیر بن نعمان ملیں گے، نہ ہی اس سے بات کریں گے اور نہ ہی اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان صلح کرائیں گے، کیونکہ اُس نے ان کی بیٹی کو طلاق دے دی تھی اور اب وہ اپنی بیوی کی طرف رجوع کرنا چاہتا تھا، اور اس سے صلح کرنے کی کوشش میں تھا۔ اسبابِ نزول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مؤمن کے لیے مناسب نہیں کہ اُس کی قسم اسے اُس بھلائی کے کام سے منع کردے جس کے نہ کرنے کی اس نے قسم اٹھالی ہو۔

آیت کریمہ کے اختتام میں اللہ سبحانہ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ سب سننے والا ہے، یعنی ان کی قسموں کو سننے والا ہے، اور سب جاننے والا ہے، یعنی ان کے احوال اور مقاصد کو جانتا ہے، اس سے ذرہ برابر بھی کوئی شے نہیں چھپتی، وہ ان کا رازداں ہے، ان کی چھپی اور کھلی تمام باتوں کو جانتا ہے، ﴿ **وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ** ﴾ "اور اللہ سب سننے اور جاننے والا ہے"۔

(عُرْضَةً)، "بہانہ"، یہ فُعلةٌ کا ہم وزن ہے، جیسے :غُرفةٌ یعنی کمرہ۔ اور یہ نصر ینصر اور ضرب یضرب دونوں بابوں سے آتا ہے، جیسے عَرضَ الشیءَ یعرِضُ ،یَعرُضُ اس کے معنی ہیں: اس کو اعتراض والا بنادیا، یعنی اُسے رکاوٹ بنادیا۔

﴿ وَلاَ تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ ﴾ "اور اللہ تعالیٰ (کے نام) کو اپنی قسموں میں اس غرض سے استعمال نہ کرو"۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر اس کو نیکی اور تقویٰ و صلح کے لیے آڑ مت بناؤ، یعنی اللہ تعالیٰ پر قسم اٹھانے کو نیکی، تقویٰ اور اصلاح والے کام کرنے کی راہ میں مانع نہ بناؤ، کہ جن کاموں کے نہ کرنے کی تم نے قسم اٹھائی ہوئی ہے، قسم کی وجہ سے ان کو مت چھوڑا کرو۔

چنانچہ ﴿**لأَيْمَانِكُمْ**﴾ **"تمھاری قسم کی وجہ سے"**، میں لام تعلیل (وجہ بتانے) کے لیے ہے، یعنی تمہاری قسموں کی وجہ سے اور ﴿**أَنْ تَبَرُّوا**﴾ **"تاکہ تم متقی ہو"** دراصل **لِاَن تَبَرُّوا "تمھارے متقی بننے کیلئے"** کے معنی میں ہے۔

2-دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ اس امت پر اپنا فضل وکرم بیان فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہماری لغو قسموں سے در گزر کا اعلان کیا ہے، جو زبانوں پر بے ساختہ جاری ہوتی ہیں، جیسا کہ عائشہؓ نے روایت کی ہے، فرماتی ہیں: یہ آیت ﴿**لاَ يُؤَاخِذُكُمْ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ**﴾ **"اللہ تمہاری لغو قسموں پر تمہاری گرفت نہیں کرے گا"**، انسان کے اس قول کے بارے میں نازل ہوئی کہ "اللہ کی قسم! نہیں، اور اللہ کی قسم! ہاں" (بخاری: 6170، 4247)۔ اور ابی قلابہ سے روایت ہے کہ: (لا والله) "اللہ کی قسم! نہیں" اور (بلى والله) "اللہ کی قسم! ہاں" عربی زبان کا ایک انداز ہے، جس سے قسم مراد نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اس نوع کی لغو قسم سے در گزر فرمایا ہے اور اس پر ہماری پکڑ نہیں ہوتی، سوائے ان قسموں کے جو ہم جان بوجھ کر اٹھائیں، یعنی جو ارادے سے اور قصداً ہو، یعنی دل سے قسم اٹھائی گئی ہو، جس میں قسم کے الفاظ دل کے اندر موجود بات کے موافق ہوتے ہیں۔

مؤاخذہ یا پکڑ کبھی کفارہ ادا کر کے ختم ہوتی ہے، یعنی قسم کھانے والا کفارہ ادا کر کے دنیا اور آخرت میں گناہ سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ کبھی پکڑ ایسی ہوتی ہے کہ جس میں کفارہ فائدہ نہیں دیتا بلکہ اس پر دنیا میں اسلامی ریاست کی طرف سے شدید تعزیری سزا دی جاتی ہے یا پھر آخرت میں بڑا مؤاخذہ کیا جائے گا۔

پہلی قسم جس میں کفارہ دیا جاتا ہے، اس کو الأيمان المنعقدة کہتے ہیں، جس کو قسم کھانے والا پورا نہ کر سکے، یعنی اس کو توڑ بیٹھتا ہے، یعنی قسم تو کھالیتا ہے مگر عمل نہیں کرتا، مثلاً اس طرح قسم کھائے کہ میں فلاں کام کروں گا، پھر وہ نہ کرے، تو اس میں کفارہ ہے، جیسے سورۃ المائدہ میں اس کو بیان کیا گیا ہے: ﴿**وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمْ الإِيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلاَثَةِ أَيَّامٍ**﴾ **"لیکن جو قسمیں تم نے پختگی کے ساتھ کھائی ہوں، ان پر تمہاری پکڑ کرے گا۔ چنانچہ اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجے کا کھانا کھلاؤ جو**

تم اپنے گھر والوں کو کھلایا کرتے ہو، یا ان کو کپڑے دو، یا ایک غلام آزاد کرو۔ ہاں اگر کسی کے پاس (ان چیزوں میں سے) کچھ نہ ہو تو وہ تین دن روزے رکھے "(المائدہ: 89)۔ اس قسم میں کفارہ دینے کے بعد اس پر کوئی بھی ذمہ داری نہیں آتی، نہ اسلامی ریاست کی طرف سے دنیا میں کوئی سزا ہے اور نہ آخرت میں کوئی گناہ ہے۔

دوسری قسم جان بوجھ کر کھائی جانے والی جھوٹی قسم ہے، جس میں انسان ایک ایسی بات کی خبر دیتا ہے جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ جھوٹ ہے، اس قسم کو الیمین الغموس کہتے ہیں، غموس کے معنی ڈوبنے کے ہیں، یہ اس لیے کہ یہ قسم آدمی کو جہنم کی آگ میں ڈبو دیتی ہے، کیونکہ ایسی جھوٹی قسموں سے لوگوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالا جاتا ہے، اور فساد اسی کے ذریعے پھیلایا جاتا ہے۔

اس قسم کی قسمیں کفارہ سے بری الذمہ نہیں ہوتیں، یہی وجہ ہے کہ اس میں کفارہ نہیں بلکہ اس میں دنیا میں اسلامی ریاست کی جانب سے شدید تعزیری سزا دی جائے گی، جس کا اندازہ قاضی مقرر کرتا ہے، جس سے قسم کھانے والے کو بھی سبق حاصل ہو اور اس کے بارے میں سننے والوں کو بھی اس کی شدت کی وجہ سے ایک عبرت حاصل ہو، اگر اسلامی ریاست کو اس کے بارے میں خبر نہ ملے تو ایسا شخص اللہ کے عذاب سے بچ نہیں پائے گا، اس کو شدید عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بیان فرمایا ہے، ابن عمرؓ سے روایت ہے: ((جاء أعرابي إلى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله ما الكبائر؟ فذكر الحديث وفيه اليمين الغموس وفيه قلت: وما اليمين الغموس؟ قال: **الذي يقتطع بها مال امرئ مسلم هو فيها كاذب**)) "ایک بدو شخص نے نبی پاک ﷺ کے پاس آکر عرض کی: یارسول اللہ! بڑے گناہ کون سے ہیں؟ ابن عمر نے آگے حدیث بیان کی، اس میں یہ بھی آیا ہے کہ جھوٹی قسم (الیمین الغموس)، راوی کہتا ہے، میں نے عرض کی: جھوٹی قسم کیا ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: **جس کے ذریعے کسی مسلمان کا مال کھایا جائے اور وہ اس میں جھوٹا ہو "**(بخاری: 6409)۔

اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے: آپ ﷺ نے فرمایا: **((خمس ليس لهن كفارة: الشرك بالله وقتل النفس بغير حق وبهت مؤمن والفرار يوم الزحف ويمين**

يقتطع بها مالاً بغير حق)) "پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کا کوئی کفارہ نہیں؛ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، بے گناہ انسان کو قتل کرنا ،مؤمن پر بہتان لگانا، میدانِ جنگ سے بھاگ آنا، اورڈبونے والی قسم (اليمين الغموس) جس کے ذریعے ناحق مال کھایا جائے" (احمد: 362/2)۔

اللہ تعالیٰ نے آیت کا اختتام اس طرح کیا ہے کہ وہ لغو قسم کی وجہ سے ہماری پکڑ نہیں کرتے، بلکہ اس پر سزا دیتے ہیں جس کا ہم دل سے ارادہ کریں، جیسا کہ ہم نے بیان کیا، پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ **غَفُورٌ حَلِيمٌ** ہیں تو اللہ تعالیٰ لغو قسم کھانے پر ہماری پکڑ نہیں کرتے، اور وہ **غَفُورٌ حَلِيمٌ** ہیں تو وہ سزاوار لوگوں کے لیے سزا میں جلدی نہیں کرتے۔ اور لفظ الحليم فعل (حَلُمَ يَحْلُمُ حِلماً) سے ہے، جس کے معنی سزا میں تاخیر کرنے کے ہیں۔

فہرست

قرآنِ مجید زبان دانی کا معجزہ ہے جو نبی محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کرتا ہے

مصعب عمیر-پاکستان

تعارف: قرآنِ مجید عربی زبان کا معجزہ ہے جس کی مثل لائی نہیں جاسکتی

قرآنِ مجید معجزانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ لفظ معجزہ، **عجز** (بے بسی، لاچارگی) سے ہے، یعنی معجزہ وہ ہے کہ انسان اس کی نقل کرنے یا اس جیسی تخلیق کرنے سے قاصر ہو۔ یہ وہ حتمی تصدیقی ثبوت ہے جو آخری نبی اور رسول، محمد ﷺ کو ان کے رسالت کی توثیق کے طور پر عطا کیا گیا۔ جب "اعجاز" کے مفہوم کا اطلاق قرآن پر کیا جائے، تو اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن الہامی طور پر ہی منفرد ہے اور قرآن کا کلام اپنے معیار کے لحاظ سے انسانی صلاحیت سے بالاتر ہے۔ قرآن کا یہ چیلنج عرب کے نامور شاعروں کے سامنے پیش کیا گیا جو کہ عربی زبان پر اپنی فصاحت اور عبور و مہارت کی وجہ سے جانے جاتے تھے۔ اور یہ چیلنج قیامت تک کے لئے ہے۔

یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی سنت ہے کہ معجزات رسالت کے حق ہونے کو ثابت کرتے ہیں

اپنے رسولوں ؑ کے ذریعے پہنچائے گئے پیغام کی سچائی کو ثابت کرنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی سنت ہے۔ پیغام کے سچے ہونے کی توثیق معجزات سے ہوتی ہے، جو ان معاشروں کے لحاظ سے موزوں ہوتے ہیں جن کے لیے وہ الہامی پیغام بھیجا جاتا ہے۔ امام باقلانی اپنی کتاب "إعجاز القرآن" میں بیان کرتے ہیں "فقد أيد الله جل جلاله موسى عليه السلام وكان عصره عصر سحر بفلق البحر، وانقلاب العصا حية تسعى، وانبجاس الحجر الصلد بعيون الماء الرواء. وأيد عيسى عليه السلام وكان عهده

عهد طب بإبراء الاكمه والابرص وخلق الطير من الطين، وإحياء الموتى بإذنه "موسیٰ علیہ السلام کا دور جادو گری کا دور تھا، پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اُس دور میں سمندر کو چیر کر، بے جان عصا کو ایک جاندار اور حرکت کرتے سانپ میں بدل کر اور سخت چٹانی پتھروں سے پانی کے چشمے جاری کر کے موسیٰ علیہ السلام کی مدد کی۔ عیسیٰ علیہ السلام کا دور طب میں مہارت کا دور تھا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اندھے اور کوڑھی کو (بلا علاج) ٹھیک کر کے، مٹی کے پرندے میں جان ڈال کر اور مردہ کو زندہ کر کے عیسیٰ علیہ السلام کی مدد کی"۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ جادو گری کے فن میں مہارت کے دور میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے موسیٰؑ کی ایسے معجزات سے مدد کی جس کا اپنے فن میں نامور اور مشّاق بھی مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ساحروں میں سے سب سے ماہر جادو گر، موسیٰؑ کے دین پر ایمان لاتے ہوئے سجدے میں گر پڑے۔ اسی طرح، طب کی مہارت کے دَور میں، موت، بیماری اور علاج سے تعلق رکھنے والے معجزات کے ذریعے عیسیٰؑ کی مدد کی گئی۔ یہ ایسا چیلنج تھا جس کا بنی اسرائیل کے ماہر طبیب بھی مقابلہ نہیں کر سکتے پس لوگوں پر عیسیٰ علیہ سلام کے پیغام کی حقانیت واضح ہو گئی۔

قرآنِ پاک کے زبان دانی کے معجزے نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو ثابت کیا

جہاں تک آخری پیغمبرؐ، اللہ کے رسول ﷺ اور ہمارے آقا محمد ﷺ کا ذکر ہے، وہ اُس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جو عربی زبان پر عبور اور مہارت رکھتی تھی۔ دیگر معجزات کے علاوہ، جو قرآنِ مجید اور مستند احادیث میں مذکور ہیں، رسول اللہ ﷺ کو قرآنِ پاک کا معجزہ عطا کیا گیا جو کہ انسانیت کے لئے بے مثال اور عاجز کر دینے والا تھا۔ دوسرے معجزات کے برعکس، صرف قرآنِ مجید کے معجزے ہی کو چیلنج کے طور پر اہلِ مکہ کے سامنے رکھا گیا، تاکہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی توثیق پر مہر ثبت ہو جائے۔

قرآنِ پاک ایک ایسا معجزہ ہے جو کہ تمام انسانیت کو عاجز کر دینے والا اور یکتا و لاثانی ہے کیونکہ یہ تمام انسانیت کے لئے قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ امام باقلانی بیان کرتے ہیں: ولما أرسل رسوله محمدا، صلى الله عليه وسلم، إلى الناس أجمعين، وجعله خاتم النبيين - أيده بمعجزات حسية كمعجزات من سبقه من المرسلين، وخصه بمعجزة عقلية خالدة، وهي إنزال القرآن الكريم، الذى لو اجتمعت الانس والجن على أن يأتوا بمثله لم يستطيعوا ولم يقاربوا، ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا، "اور جب اللہ سبحانہ وتعالی نے اپنے رسول، محمد ﷺ کو تمام انسانیت کے لئے آخری نبی بنا کر مبعوث کیا، تو اللہ سبحانہ وتعالی نے قابلِ محسوس معجزات کے ساتھ آپ ﷺ کی مدد کی جیسا کہ آپ ﷺ سے پہلے آنے والے رسولوں کو معجزات عطا کیے تھے۔ تاہم، آپ ﷺ کو ایک ہمیشہ باقی رہنے والا عقلی معجزہ عطا کر کے ایک ممتاز مقام عطا کیا، جو کہ قرآنِ پاک کا نزول ہے۔ اگر تمام انسان و جن اِس جیسی کوئی مثال بنانے کے لئے اکٹھے ہو جائیں تو نہیں بنا سکیں گے بلکہ وہ اس کے قریب بھی نہ پہنچ سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کی مدد ہی کیوں نہ کر لیں"۔

قرآنِ پاک جیسا لسانی معجزہ اُس معاشرے کے لحاظ سے بالکل موزوں تھا جس پر قرآن نازل ہوا۔ امام باقلانی نے لسانی مہارت میں عربوں کی قابلیت کو تفصیلاً بیان کیا اور ساتھ ہی یہ بھی بیان کیا کہ جب عربوں کو قرآن کے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا تو وہ کس طرح عاجز و بے بس ہو گئے، بیان کرتے ہیں: وكان ذلك في زمان سما فيه شأن البيان، وجلت مكانته في صدور أهله، وعرفوا باللسن والفصاحة، وقوة العارضة في الاعراب عن خوالج النفوس، والابانة عن مشاعر القلوب. وظل رسول الله صلوات الله عليه، يتحداهم بما كانوا يعتقدون في أنفسهم القدرة عليه، والتمكن منه، ولم يزل يقرعهم ويعجزهم، ويكشف عن نقصهم، حتى استكانوا وذلو "یہ وہ زمانہ تھا جب اظہارِ بیان عروج پر تھا اور اس کی قوت لوگوں کے دلوں پر راج کرتی تھی۔ وہ اپنی زبان دانی اور بلاغت کے ساتھ ساتھ نفسانی جذبات کے بھرپور اظہار اور دلوں میں جذبات اُبھارنے کی طاقت کے لحاظ سے جانے جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ عربوں کو مسلسل اس شے پر چیلنج کرتے رہے جس میں وہ خود کو بہت قابل سمجھتے تھے اور مستحکم تھے۔ اور آپ ﷺ

مسلسل عربوں کو حیران کرتے رہے اور ان کی عاجزی ظاہر کر کے انہیں شرمندہ کرتے رہے یہاں تک کہ ان کی خامی و کمزوری منکشف ہو گئی اور وہ ذلیل ہو کر رہ گئے"۔ در حقیقت، عرب اپنی زبان پر عبور و کمال میں اس قدر منہمک تھے کہ انہوں نے کسی اور معاملے میں کم ہی مہارت حاصل نہیں کی۔

یہ اللہ سبحانہ وتعالی کی حکمت تھی کہ آخری نبی، محمد ﷺ کو ایسا معجزہ عطا کیا گیا جو آپ ﷺ کے وصال کے بعد بھی رہتی دنیا تک انسانیت میں موجود ہے۔ ابنِ خلدون اپنی تصنیف "المقدمه" میں قرآن کے معجزہ کے منفرد ہونے کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: فاعلم أن أعظم المعجزات وأشرفها وأوضحها دلالة القرآن الكريم المنزل على نبينا محمد فإن الخوارق في الغالب تقع مغايرة للوحي الذي يتلقاه النبي ويأتي بالمعجزة شاهدة بصدقه والقرآن هو بنفسه الوحي المدعى وهو الخارق المعجز فشاهده في عينه ولا يفتقر إلى دليل مغاير له كسائر المعجزات مع الوحي فهو أوضح دلالة لاتحاد الدليل والمدلول فيه وهذا معنى قوله ما من نبي من الأنبياء إلا وأتي من الآيات ما مثله أمن عليه البشر وإنما كان الذي أوتيته وحيا أوحي إلي فأنا أرجو أن أكون أكثرهم تابعا يوم القيامة يشير إلى أن المعجزة متى كانت بهذه المثابة في الوضوح وقوة الدلالة وهو كونها نفس لوحي كان الصدق لها أكثر لوضوحها فكثر المصدق المؤمن وهو التابع ولأمه، "جان لو کہ قرآنِ کریم جو ہمارے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے، کا ثبوت اور دلیل، عظیم ترین، پاکیزہ اور واضح ترین معجزہ ہے۔ قاعدے کے طور پر، معجزات اس وحی کے علاوہ ہوتے ہیں جو ایک نبی پر آتی ہے۔ معجزات، اُس نبی علیہ السلام کی صداقت کے ثبوت کے طور پر ہوتے ہیں اور یہ بالکل طے بات ہے۔ اس کے بر خلاف، قرآنِ مجید، خود ایک وحی ہے، جبکہ یہ اپنے آپ میں ہی ایک حیرت انگیز معجزہ بھی ہے۔ یہ خود ہی اپنا ثبوت ہے۔ وحی سے منسلک دوسرے معجزات کی طرح اسے کسی بیرونی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک شفاف ترین ثبوت ہے کیونکہ اس میں دلیل اور مدلل دونوں جمع ہو گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کا یہی مفہوم ہے، "**«مَا مِن نبيّ من الأنبياء إلا أُعْطِيَ من الآياتِ ما مثلُهُ آمَنَ عليه البشر، وَإِنَّمَا كانَ الذي أُوتيتُهُ وَحْيا أَوْحَاهُ الله إِليَّ ، فأرجو أن أَكونَ أَكثرَهُم تابعا يومَ القيامةِ»**"ہر نبی کو بنی نوع انسان کی یقین دہانی کے لئے بے مثال

نشانیاں (معجزات) دی گئیں۔ جو نشانی مجھے عطا کی گئی وہ وحی بھی ہے جو مجھ پر نازل ہوئی۔ اسی لئے میں قیامت کے روز سب سے زیادہ پیروکاروں کی امید کرتا ہوں" (بخاری)۔ آپ ﷺ کا اشارہ اس حقیقت کی طرف تھا کہ ایک معجزہ جو بذاتِ خود وحی بھی ہو، ثبوت کو اس قدر واضح اور مضبوط کر دیتا ہے کہ اس کے اس قدر واضح ہونے کی وجہ سے ہی لوگوں کی ایک بڑی تعداد اسے سچا پائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کی کثیر تعداد رسول اللہ ﷺ کو سچا مانتی ہے اور اُن پر ایمان رکھتی ہے اور یہی اسلامی امت ہے"۔

عربی زبان کے ماہرین کے لئے قرآنِ کریم کا چیلنج

اللہ سبحانہ وتعالی نے عربوں کو قرآن جیسا کلام بنا کر لانے کا چیلنج دیا اور پھر ان کی مایوسی میں اضافہ کرتے ہوئے اس چیلنج کو کم کر کے صرف دس سورتوں اور پھر صرف ایک ایسی سورت کا کر دیا جو سورتوں میں سے مختصر ترین سورت ہے، جو صرف تین آیات پر مشتمل ہے۔ مشہور عالم سیوطی اپنی تصنیف، **"قرآنی علوم میں مہارت"** (الإتقان في علوم القرآن) کی جلد 3، باب 64 میں اس چیلنج کی تاریخ کو یوں قلمبند کرتے ہیں: وَلَمَّا جَاءَ بِهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِمْ وَكَانُوا أَفْصَحَ الْفُصَحَاءِ ومصا قع الْخُطَبَاءِ وَتَحَدَّاهُمْ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِهِ وَأَمْهَلَهُمْ طُولَ السِّنِينَ فَلَمْ يَقْدِرُوا كَمَا قَالَ تَعَالَى {فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ } ثُمَّ تَحَدَّاهُمْ بِعَشْرِ سُوَرٍ مِنْهُ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى {أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ } ثُمَّ تَحَدَّاهُمْ بِسُورَةٍ فِي قَوْلِهِ: {أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ } الْآيَةَ ثُمَّ كَرَّرَ فِي قَوْلِهِ: {وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّنْ مِثْلِهِ } الْآيَةَ فَلَمَّا عَجَزُوا عَنْ مُعَارَضَتِهِ وَالْإِتْيَانِ بِسُورَةٍ تشبهه على كثرة الخطباء فيهم وَالْبُلَغَاءِ نَادَى عَلَيْهِمْ بِإِظْهَارِ الْعَجْزِ وَإِعْجَازِ الْقُرْآنِ فَقَالَ: {قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً } "جب رسول اللہ ﷺ اُن کے سامنے یہ چیلنج لائے،

اس وقت وہ لوگ سب سے زیادہ فصیح تھے، تو آپ ﷺ نے انہیں چیلنج کیا کہ وہ قرآن جیسا کچھ لا کر دکھائیں، کئی سال گزر گئے مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ اللہ سبحانہ وتعالی نے ارشاد فرمایا، ﴿ **فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ** ﴾ **"اگر یہ واقعی سچے ہیں تو اس جیسا کلام بنا کر لائیں"** (سورۃ الطور: 34)، پھر انہیں دس سورتوں کا چیلنج دیا گیا، جب اللہ سبحانہ وتعالی نے ارشاد فرمایا، ﴿**أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ**﴾ **"کیا یہ کہتے ہیں کہ اس (محمد ﷺ) نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے۔ کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اس جیسی دس سورتیں بنا کر لاؤ اور اللہ سبحانہ وتعالی کے علاوہ جس کو مدد کے لئے بلا سکتے ہو، تو بلا لو، اگر تم سچے ہو"** (سورۃ الہود: 13)۔ پھر انہیں صرف ایک ہی سورت لانے کا چیلنج دیا، جب اللہ سبحانہ وتعالی نے ارشاد فرمایا، ﴿**أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِثْلِهِ**﴾ "کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس (محمد ﷺ) نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے۔ تو کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم اس جیسی ایک سورت ہی بنا لاؤ" (سورۃ یونس: 38)۔ جب وہ (عرب) قرآن جیسی ایک سورت بھی تیار کرنے سے قاصر رہے حالانکہ ان میں سب سے اعلیٰ پائے کے زبان پر عبور رکھنے والے فصیح وبلیغ موجود تھے تو ان کے چیلنج کو پورا کرنے میں ناکامی نے قرآن کی بے مثالی اور اعجاز کو واضح کر دیا۔ اللہ سبحانہ وتعالی نے ارشاد فرمایا، ﴿**قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيراً**﴾ "کہہ دو کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا بنا لائیں تو اس جیسا نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی ہو جائیں" (سورۃ الاسراء: 88)۔

عہدِ نبوی ﷺ میں عربی لغت کے ماہرین کی ناکامی

شاعری اور نثر، دونوں میں ماہرِ لسانیات کی کثیر تعداد کی موجودگی کے باوجود، قرآن کے چیلنج کا مقابلہ نہ کیا جا سکا۔ امام باقلانی بیان کرتے ہیں: وقد أدهش القرآن العرب لما سمعوه، وحير ألبابهم

وعقولهم بسحر بيانه، وروعة معانيه، ودقة ائتلاف ألفاظه ومبانيه، فمنهم من آمن به ومنهم مكفر، وافترقت كلمة الكافرين على وصفه، وتباينت في نعته، فقال بعضهم، هو شعر، وقال فريق: إنه سحر، وزعمت طائفة أنه أساطير الاولين اكتتبها محمد، فهى تملى عليه بكرة وأصيلا، وذهب قوم أنه إفك افتراه وأعانه عليه قوم آخرون. "جب عربوں نے اسے سنا تو قرآن کریم نے انہیں دَنگ کر دیا۔اس (قرآن) نے اپنے مسحور کن اندازِ بیان، اپنے معانی کی شان، الفاظ کے احاطے اور امتزاج میں باریکی سے ان کے دل و دماغ کو مسحور کر دیا۔ایسے بھی لوگ تھے جو اس پر ایمان لانے والے تھے اور ایسے بھی تھے جو اس کا انکار کرنے والے تھے۔اس کی خصوصیات کے حوالے سے اور اس کی ترکیب کے بارے میں کفار کے مختلف ردِ عمل تھے۔ان میں سے بعض نے کہا کہ یہ شاعری ہے اور ایک گروہ نے کہا کہ یہ سحر ہے جبکہ دوسرے گروہ نے دعویٰ کیا کہ یہ قدیم لوگوں کے افسانے ہیں، جو محمد ﷺ نے لکھے ہیں اور جو صبح و شام اُن کو کوئی لکھوا جاتا ہے۔جبکہ بعض لوگوں کا کہنا یہ تھا کہ یہ جھوٹ ہے جو محمد ﷺ نے گھڑ لیا ہے اور اس میں اجنبی لوگوں نے ان کی مدد کی ہے"۔

جب عرب قرآنِ کریم کو سنتے تھے تو اس کی اعلیٰ و شاندار فصاحت و بلاغت سے مغلوب ہوتے چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ عربی زبان کے ماہر، ولید بن مغیرہ نے رسول اللہ ﷺ کو جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے سنا تو اس نے کہا: والله ما منكم رجل أعرف بالأشعار مني ولا أعلم برجزه وقصيده مني والله ما يشبه الذي يقوله شيئاً من هذا، والله إن لقوله الذي يقوله لحلاوة وإن عليه لطلاوة، وانه لمورق أعلاه مغدق أسفله، وإنه ليعلو ولا يعلى عليه " اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی شخص مجھ سے زیادہ شاعری پر عبور رکھنے والا نہیں یا مجھ سے زیادہ شاعری کے رَجَز (شعر کی ایک بحر کا نام، اوزان میں سے ایک وزن) یا قصیدہ میں علم نہیں رکھتا! میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسی کوئی بھی شے نہیں جو ذرہ بھر بھی اس سے مشابہت رکھتی ہو جو آپ ﷺ کہتے ہیں۔اللہ کی قسم، وہ جو کچھ بھی بولتے ہیں، اس میں شائستگی اور مٹھاس ہے۔یہ اپنی ابتداء پر فراواں اور وسیع ہے اور انتہا پر تازہ و شاداب ہے۔یقیناً یہ سب سے اعلیٰ و بلند ہے اور اس سے اعلیٰ و برتر کچھ نہیں"۔یہ اعتراف اس حقیقت کے باوجود ہے کہ ولید بن مغیرہ تکبر کے ساتھ اپنے کفر پر ڈٹا رہا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں عربی لسانیات کے سرِ فہرست ماہرین، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پائے جاتے تھے۔ کوئی بھی قرآن جیسی ایک بھی سورت آج تک نہیں بنا سکا اور سب سے زیادہ علم رکھنے والوں نے تو اس کی کوشش ہی نہیں کی۔

معجزاتی قرآن کا بے مثال انداز

اپنی تصنیف، إعجاز القرآن میں، امام باقلانی فرماتے ہیں: تأليف القرآن البديع، ووصفه الغريب، ونظمه العجيب، "قرآنِ پاک کی ترکیبی تالیف بے مثال تھی، اسکا وصف ماورائے فطرت اور اس کا نظم غیر معمولی ہے"۔

امام خطابی، بیان إعجاز القرآن، میں فرماتے ہیں: اعلم أن القرآن إنما صار معجزًا لأنه جاءَ بأَفصح الألفاظ في أحسن نظوم التأليف مضمنًا أصح المعاني "جان لیں کہ قرآن معجزانہ طور پر بے مثال ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ فصیح الفاظ کے ساتھ آیا ہے جو کہ سب سے احسن ترکیب میں تالیف کردہ ہیں، اور جو سب سے زیادہ درست معانی رکھتے ہیں"۔

اپنی کتاب، الإتقان في علوم القرآن (علومِ قرآن میں مہارت) میں امام سیوطی واضح کرتے ہیں کہ کیسے قرآن کے : وَبَلَاغَةِ أُسْلُوبٍ تَبْهَرُ الْعُقُولَ وَتَسْلُبُ الْقُلُوبَ وَإِعْجَازُ نَظْمٍ لَا يَقْدِرُ عَلَيْهِ إِلَّا عَلَّامُ الْغُيُوبِ "اسلوب (انداز) نے عقلوں کو حیران کر دیا اور دلوں کو مغلوب کر دیا جبکہ اس کی ادبی شکل (نظم) کا معجزہ کہ اللہ عالمِ غیب کے سوا کوئی ایسے کلام پر قادر نہیں"۔

آیات کے الفاظ، انداز (اسلوب) اور معانی، انسانی جذبات کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ قرآن کا معجزہ اپنی فصاحت و بلاغت میں حیرت انگیز درجہ کا ہے۔

فصاحت کے بارے میں کہا جاتا ہے: سلامة الألفاظ من اللَّحْن والإبهام وسوءِ التأليف، "الفاظ گرامر کی غلطی، ابہام اور بری ترتیب سے پاک ہوں"۔

بلاغت کے بارے میں کہا جاتا ہے: عِلْمُ البَلاغَةِ: عِلْمُ الْمَعانِي والبَيانِ والبَديعِ "بلاغت کا علم یہ ہے: علمِ بلاغت، علمِ معانی اور خطابت کا علم"۔ علم معانی سے مراد ہے ایسے مناسب الفاظ کا چناؤ جن کے اندر موجود معانی لغوی ترکیب کے اعتبار سے، مقصود تصور کے اظہار کیلئے انتہائی موزوں ہوں۔ بیان کا علم، سننے والے اور اس کے حالات کے مطابق مناسب الفاظ استعمال کرنے سے متعلق ہے، اس اصول کی بناپر کہ جملے کا مقصد و مقصود کیا ہے۔ صراحت (بدیع) کا علم، معانی اور الفاظ دونوں کے ذریعے، کلام کی وسعت و جمال کے متعلق ہے تاکہ اس کے اثر کی مضبوطی جاندار ہو۔

اسلوب معانی کو مربوط الفاظ کے ذریعے ترتیب دینا ہے۔ اسلوب زبان کے ذریعے معنی کو ایک شکل دینے کا طریقہ ہے۔ قرآن کے اسلوب میں ایسی شفاف وضاحت، قوت اور جمال ہے کہ بنی نوع انسان اس پر قادر نہیں۔ اس کی ادبی شکل (نظم)، عربوں کے رائج انداز کے مطابق نہیں اور یہ لاثانی ہے۔ اپنے نظم (ادبی شکل) میں، قرآن عربوں کی اختیار کردہ نثر اور شاعری میں سے کسی چیز سے مماثل نہیں۔

قرآن کے معجزاتی اسلوب میں موجود شفافیت (وضوح) کے وصف کی تفصیل:

اسلوب میں شفافیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب جب اظہار کے لیے مناسب ترین الفاظ/اظہارِ بیان اختیار کرنے سے مقصود معانی نمایاں ہو جائیں۔ اللہ سبحانہ وتعالی نے ارشاد فرمایا، ﴿**وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُونَ**﴾ "اور کافر کہیں گے، اس قرآن کو سنا ہی نہ کرو اور غُل مچا دیا کرو (جب وہ پڑھنے لگیں)، شاید کہ تم غالب ہو جاؤ" (سورۃ فصّلت: 26)۔ اس آیت کی تفسیر میں، ابنِ کثیر کہتے ہیں:

وكانوا إذا تلي عليهم القرآن أكثروا اللغط والكلام في غيره، حتى لا يسمعوه، "اور جب ان کے سامنے قرآن پڑھا جاتا تھا تو وہ شور شرابا اور ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتے تھے تاکہ وہ اسے سن ہی نہ سکیں"۔

﴿ وَالْغَوْاْ فِيهِ ﴾، "شور شرابا کرنے" کے حوالے سے امام مجاہد تبصرہ کرتے ہیں: الْمُكَاءُ وَالتَّصْفِيرِ، وَتَخْلِيطٌ مِنَ الْقَوْلِ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا قَرَأَ، قُرَيْشٌ تَفْعَلُهُ، " رسول اللہ ﷺ جب قرآن کی تلاوت کرتے تو مشرکین سیٹیاں بجاتے، آوازیں لگاتے اور قہقہے لگاتے اور قریش نے ایسا ہی کرتے تھے"۔ابنِ عباسؓ نے اس کی تفسیر کی ہے کہ یہ (عیبوہ) ہے یعنی وہ عیب نکالنے لگتے تھے۔

در حقیقت، قرآن کے شفاف اندازِ بیان نے عرب کی مہارتِ زبان کو زک پہنچائی اور وہ اپنی سماعت کو اور چیزوں پر مرکوز کرنے پر مجبور ہو گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن ان پر غالب آجائے۔

امام باقلانی قرآنِ پاک کی زبردست شفافیت کے حوالے سے کہتے ہیں: فما أشرفه من كتاب يتضمن صدق متحمله، ورسالة تشتمل على قول مؤديها. بين فيه سبحانه أن حجته كافية هادية، لا يحتاج مع وضوحها إلى بينة تعدوها، أو حجة تتلوها، وأن الذهاب عنها كالذهاب عن الضروريات، والتشكك في المشاهدات، "اس کتاب کے عزت و شرف کے اعلیٰ ترین ہونے کیا کہنے، جو اپنے لانے والے کی سچائی کی ضامن ہے اور اس کا پیغام ہدایت دینے والے کے الفاظ پر مشتمل ہے۔اُس ذاتِ پاک نے دلائل واضح کئے جو ہدایت کے لئے کافی ہیں۔اس کلامِ ربی کی شفافیت و وضاحت کے لیے مزید کسی وضاحتی ثبوت یا دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔اس سے انحراف، ایک بدیہی چیز کو ترک کر دینے اور واضح حقیقت پر شک کرنے کے مترادف ہے"۔

قرآن کے معجزاتی اسلوب میں موجود قوت کے وصف کی تفصیل:

عربی نہ صرف گرامر کے لحاظ سے ایک پیچیدہ اور باریک زبان ہے بلکہ یہ ایک صوتی اثرات پیدا کرنے والی زبان ہے، جہاں الفاظ صوتی اثرات پیدا کر کے اپنا مفہوم اور معانی بالکل واضح انداز سے بیان کر دیتے ہیں۔

قرآن کے اسلوب میں موجود قوت الفاظ کے لاثانی انتخاب کی وجہ سے ہے جو اُن معانی سے مطابقت رکھتے ہیں جو وہ الفاظ دیتے ہیں۔

قرآن میں رقیق معانی کا اظہار رقیق آواز والے الفاظ کے ذریعے ہوا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ﴿وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا (17) عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا﴾ "اور اُن کو وہاں ایسے جام پلائے جائیں گے جن میں زنجبیل کی آمیزش ہو گی، اور وہاں (بہشت میں) ایک چشمہ ہے، جس کا نام سلسبیل ہے" (سورۃ الانسان: 17-18)۔

فراوانی (جَزْل) کے معانی کا اظہار، کانوں کو فراوانی کا احساس دینے والے الفاظ کے ذریعے کیا گیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ﴿ إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا (21) لِّلطَّاغِينَ مَآبًا (22) لَّابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا ﴾ "بے شک جہنم گھات میں ہے، سرکشوں کا ٹھکانہ ہے۔ وہ وہاں مدتوں پڑے رہیں گے" (سورۃ النباء: 21-23)۔

مذمت (مُسْتَنْكَر) کا اظہار اُن الفاظ کے ذریعے کیا گیا ہے جو سننے میں غیر خوشگوار ہوں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا، ﴿ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ﴾ "بے شک آوازوں میں سب سے ناپسندیدہ آواز گدھے کی آواز ہے" (سورۃ لقمان: 19)۔

قرآن کے اسلوب میں موجود جمال کا بیان:

جہاں تک اسلوب میں جمال کا تعلق ہے، یہ ان معانی کے لئے خالص ترین اور موزوں ترین الفاظ کے چناؤ کے نتیجے میں ہے۔ جو معنی یہ الفاظ بیان کرتے ہیں اور اس کے ساتھ اسی جملے یا اس سے متصل جملوں میں دوسرے الفاظ اور معانی مل کر ایک انتہائی انگیز اور دل میں اتر جانے والی منظر کشی کرتے ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالی نے ارشاد فرمایا، ﴿ **رُّبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (2) ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ** ﴾ "ایک وقت آئے گا کہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔ (اے محمد ﷺ) اُن کو ان کے حال پر ہی رہنے دو کہ کھائیں اور بَرت لیں اور ان کی آرزوئیں انہیں مشغول رکھیں، عنقریب وہ (اس کا انجام) جان لیں گے" (سورۃ الحجر: 3-2)۔

امام باقلانی نے قرآن کے کلام کے جمال کے حوالے سے کہا: والمنادى على نفسه بتميزه، وتخصصه برونقه وجماله، واعتراضه في حسنه ومائه "اس (قرآن) کی انفرادیت و رونق، اسکی جاندار وضاحت (جمال)، اس کا کمال اور روانی کا اظہار خود اعلان کرتے ہیں..."۔ امام باقلانی مزید کہتے ہیں: فكل كلمة لو أفردت كانت في الجمال غاية "ہر ہر لفظ، خواہ وہ ایک اکیلا لفظ ہی کیوں نہ ہو، اپنے جمال میں اعلیٰ ترین درجے پر ہے"۔

سید قطب اپنی مفصل اور بصیرت انگیز تصنیف، (التصور الفني في القرآن) "قرآن کے فن کی عکاسی" میں بیان کرتے ہیں: فانظر إلى تعبير جميل كهذا التعبير: {وَلَوْ تَرَى إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُو رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ}. هذا التعبير الذي يرسم صورة حية للخزي في يوم القيامة، ويصور هؤلاء المجرمين شخوصًا قائمة يتملاها الخيال، وتكاد تبصرها العين لشدة وضوحها، وتسجيل هيئتها "ناكسو رؤوسهم" وعند من؟ "عند ربهم" فيخيل للسامع أنها حاضرة لا متخيلة.. هذه الصورة للهول لا تساوي من باحث في البلاغة۔ " اظہار کے جمال کی مثال کے طور پر اس جملے کے اندازِ منظر کشی پر غور کریں { **وَلَوْ تَرَى إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُو رُءُوسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ** } "اور تم (تعجب کرو) جب دیکھو گے کہ گنہگار اپنے پروردگار

کے سامنے سر جھکائے ہوں گے "(سورۃ السجدہ: 12)۔ یہ اظہار، قیامت کے دن کی رسوائی کی ایک لرزتی ہوئی عکاسی کرتا ہے۔ اس منظر میں وہ مجرم، اس طرح پچھتاتے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں کہ منظر تخیل پر چھاتا چلا جاتا ہے۔ وضاحت کی شفافیت کی وجہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آنکھیں نہ صرف وہ حقیقت دیکھ رہی ہیں بلکہ اُن کی حالت بھی ظاہر ہو رہی ہے جیسے کہ ، **نَاكِسُو رُءُوسِهِمْ** "اپنے سر جھکائے ہوئے"، اور کس کے سامنے ؟ **عِنْدَ رَبِّهِمْ،** "اپنے رب کے سامنے"۔ چنانچہ سننے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ اس منظر میں موجود ہے اور یہ کوئی تخیل نہیں۔ اس ہولناکی کی ایسی منظر کشی کا وضاحت و بلاغت میں کوئی ثانی نہیں۔

قرآن کی ادبی تشکیل

قرآنِ پاک نے عربی زبان کے ماہرین کو شعر اور نثر کے اظہار کی معروف اقسام (طِرَاز) کے برعکس قرآن کی اپنی صنفِ تحریر کے اظہار سے شش و پنج میں ڈال دیا اور یہ امر آج تک تمام انسانیت کیلئے باعثِ حیرت ہے۔ امام سیوطی اپنی تصنیف، (الإتقان في علوم القرآن) "قرآن کے علوم میں مہارت" میں لکھتے ہیں: إِعْجَازُ نَظْمٍ لَا يَقْدِرُ عَلَيْهِ إِلَّا عَلَّامُ الْغُيُوبِ "یہ ادبی طرز کا ایسا معجزہ ہے جس پر کوئی قادر نہیں، سوائے عالمِ غیب (اللہ) کے"۔

اپنی ادبی طرز (نظم) میں قرآنِ پاک ہم آہنگ اور بالترتیب تال جیسی شاعری (الشِعْر المَوْزُون المُقَفَّى) کے روایتی طریقے کی پیروی نہیں کرتا۔

جہاں تک نثر کی اقسام کا تعلق ہے، تو قرآنِ پاک آزاد، غیر منظوم نثر (النَثْر المُرْسَل) کے طریقے پر بھی نہیں ہے۔ قرآن انسان کے بنائے ہوئے النَثْر المُزْدَوِج (شاعری اور آزاد نثر کے امتزاج) کے طریقے کے مطابق بھی نہیں ہے۔ مزدوج طریقے کی تشریح یوں ہے: يقوم هذا الأسلوب على تقسيم العبارات،

وبراعة الموازنة بين الجمل؛ إذ تتعادل فيه الألفاظ، وتزدوج الجمل في تنسيقٍ منتظم، يتراوح بين الإيجاز والمساواة والإطناب، بحسب مقتضى الحال، "یہ طریقہ عبارت کی تقسیم کی بنیاد پر، جملوں کے متناسب توازن پر مشتمل ہوتا ہے۔ الفاظ توازن میں ہوتے ہیں اور جملے باقاعدہ ترتیب سے اختصار (إيجاز)، برابری (مُسَاوَاة) اور طول ومبالغہ (إِطْناب) کے ساتھ دہرائے جاتے ہیں، چاہے جو بھی موقع محل ہو"۔ اسی طرح قرآن قافیہ بند نثر (النَثْر المَسْجُوع) کے مطابق بھی نہیں ہے۔

قرآنِ پاک ایک ایسا منفرد کلام ہے جو عربوں نے اس سے پہلے نہ تو کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی اس کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ یہ حقیقت، کہ قرآن مجید ایک نوعِ خاص اور منفرد شاہکار ہے، ہر لحاظ سے واضح ہے اور یہ ایک ایسے نرالے انداز سے وضاحت وعکاسی کرتا ہے کہ جس کی مثل نوعِ انسانی کر ہی نہیں سکتی۔

نثر کی ایک مخصوص قسم جو شاعری سے ملتی جلتی مگر شاعری نہیں ہے

قرآنِ پاک میں ایسی نثر ملتی ہے جو شاعری سے مماثلت تو رکھتی ہے مگر یہ شاعری نہیں ہے اور نثر کی ہی ایک مخصوص قسم ہے۔ قرآنِ مجید میں ہے، ﴿**وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ**﴾ "(اللہ) انہیں رُسوا کرے گا اور ان کے خلاف تمہاری مدد کرے گا اور مومنین کے سینوں کو شفا بخشے گا "(سورۃ التوبہ: 14)۔ قرآنِ مجید میں ہے، ﴿**لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ**﴾ "تم ہر گز نیکی (الْبِرَّ) کو نہیں پہنچ سکو گے جب تک کہ تم اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے" (سورۃ آل عمران: 92)۔ ان دونوں آیات میں موجود نثر کے الفاظ اشعار کی صورت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ پہلی آیت کے الفاظ ایسے پیش کیے جا سکتے ہیں: ويخزهم وينصركم عليهم، ويشف صدور قوم مؤمنين۔ دوسری آیت کے الفاظ ایسے پیش کیے جا سکتے ہیں: لن تنالوا البر حتى، تنفقوا مما تحبون۔ تاہم یہ اشعار نما قافیے شاعری نہیں ہیں۔ بلکہ در حقیقت، یہ نثر کی ایک ایسی مثل ہیں جو کہ انتہائی نرالی اور بے مثال ہے۔

اسی طرح قرآن کی نثر کی وہ قسم بھی موجود ہے جو ہر لحاظ سے شاعری سے کوسوں دور ہے: ﴿**وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ (1) وَمَا أَدْرَاكَ مَا الطَّارِقُ (2) النَّجْمُ الثَّاقِبُ (3) إِن كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ (4) فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ مِمَّ خُلِقَ (5) خُلِقَ مِن مَّاءٍ دَافِقٍ (6) يَخْرُجُ مِن بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ**﴾ "قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی، اور تم کو کیا معلوم کہ رات کو نمودار ہونے والا کیا ہے۔ وہ تارا ہے چمکنے والا، کوئی نفس ایسا نہیں جس پر کوئی نگہبان مقرر نہ ہو، تو انسان کو دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا ہوا ہے جو پیٹھ اور سینے کے بیچ (یعنی دونوں کے ملنے کے نتیجے) میں سے نکلتا ہے" (سورۃ الطارق: 7-1)۔

قرآن کی ادبی نوع میں فقرہ اور نَفَس (سانس) کو طویل یا مختصر کرنا

قرآنِ پاک میں جملے اور جملے کے حصوں پر مشتمل پیراگراف یا تحریر کے ٹکڑے موجود ہیں۔ ان کا طُول یا اختصار تحریر میں بدلتا رہتا ہے۔ تحریر کے ساتھ تلاوت کے دوران سانس کا ایک نظم ہے، جس سے قاری ایک ہی سانس میں تلاوت کر لیتا ہے۔

قرآن مجید میں نثر کی ایسی قسم موجود ہے جس میں تحریر اور نفس دونوں طویل ہیں: ﴿**وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا رَحِيمًا**﴾ "اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور جب یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے تو آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے مغفرت کی دعا کرتے تو یقیناً وہ اللہ کو بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا پاتے" (سورۃ النساء: 64)۔ اسی طرح قرآن مجید میں ہی نثر کی ایسی قسم بھی موجود ہے جس میں فقرے اور سانس کو مختصر کیا گیا ہے: ﴿**وَالشَّمْسِ وَضُحَاهَا (1) وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا (2) وَالنَّهَارِ إِذَا جَلَّاهَا**

(3) وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشَاهَا﴾ "قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔ اور چاند کی جب وہ اس کے پیچھے چلے۔ اور دن کی جب وہ اسے روشن کر دے۔ اور رات کی جب وہ اس پر چھا جائے" (سورۃ الشمس: 4-1)۔ درج بالا دونوں مثالوں میں طُول اور اختصار کے باوجود یہ نثر ہی کی مثالیں ہیں۔

علاوہ ازیں، قرآنِ پاک کی وہ تحریر جو موجود انسانی تشکیل کردہ آزاد، غیر منظوم نثر (النَثْر المُرْسَل) سے مشابہ معلوم ہوتی ہے، اس میں بھی قرآن بے مثل ویکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن یہ آیت: **﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ سَمَّاعُونَ لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهِ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا أُولَئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾** "اے رسول ﷺ! آپ کو وہ لوگ غمگیں نہ کریں جو کفر میں جلدی کرتے ہیں، ان لوگوں میں سے جو اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے جبکہ ان کے دل ایمان نہیں لائے۔ اور ان لوگوں میں سے جو یہودی ہیں، جُھوٹی باتوں پر کان لگانے والے ہیں، جاسوسی کرتے ہیں ان دوسرے لوگوں کے لئے جو تمہارے پاس نہیں آئے۔ اس کے مقام میں ثابت ہونے کے بعد، کلام میں تحریف کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر تم کو یہی (حکم) دیا جائے تو اسے قبول کر لینا اور اگر نہ دیا جائے تو بچتے رہنا۔ اور اللہ جس کو چاہے کہ اسے فتنے میں ڈالے تو تم اللہ کے مقابلے میں ہر گز اسکے لئے ذرا بھی اختیار نہیں رکھتے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے نہیں چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے۔ ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے" (سورۃ المائدہ: 41)۔

قرآنِ پاک کی ادبی شکل میں قافیہ بند نثر

قرآن پاک کی کچھ آیات کی خطابت میں (النَثْر المَسْجُوع) قافیہ بند نثر سے مشابہت محسوس ہوتی ہے مگر یہ اس سے بھی یکتا ولاثانی ہے۔ قرآن میں بیان ہے: ﴿**يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (1) قُمْ فَأَنذِرْ (2) وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ (3) وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (4) وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (5) وَلَا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ (6) وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ**﴾ "اے چادر میں لپٹے ہوئے، اٹھو! پھر خبر دار کرو۔ اور اپنے رب کی پھر بڑائی بیان کرو۔ اور اپنے کپڑے پاک رکھو۔ اور (شرک کی) گندگی سے تو الگ ہی رہو۔ اور زیادہ لینے کی غرض سے احسان نہ کرو۔ اور اپنے رب کی خاطر صبر کرتے رہو" (سورۃ المدثر: 7-1)۔

قرآنِ پاک کی کچھ آیات کی النَثْر المُزْدَوِج (شاعری اور آزاد نثر کے امتزاج) سے مماثلت محسوس ہوتی ہے، لیکن یہ اس سے بھی الگ اور بے مثال ہے۔ جیسے قرآن میں ذکر ہے: ﴿**أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ (1) حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ (2) كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ (3) ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ (4) كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ (5) لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ**﴾ "غفلت میں ڈالے رکھا تم کو زیادہ سے زیادہ مال کی حسرت نے، یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔ بے شک تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، پھر ہر گز نہیں، تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا، بے شک اگر تم علمِ یقین سے جانتے (تو غفلت میں نہ پڑتے)۔ تم ضرور دوزخ کو دیکھ لو گے" (سورۃ التکاثر: 6-1)۔

قرآن جس شے میں انسانی اُزْدَوِج سے مشابہت رکھتا ہے تو یہ (قرآن) اس میں ایسے بے عیب طریقے سے لفظی ترکیب کو بڑھا دیتا ہے کہ سننے والا ششدر رہ جاتا ہے: ﴿**قُتِلَ الْإِنسَانُ مَا أَكْفَرَهُ (17) مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (18) مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ (19) ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ (20) ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ (21) ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ (22) كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ (23) فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ (24) أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا (25) ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (26) فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا (27) وَعِنَبًا وَقَضْبًا (28) وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا (29) وَحَدَائِقَ غُلْبًا (30) وَفَاكِهَةً وَأَبًّا**﴾ "انسان ہلاک ہو جائے، یہ کیسا ناشکرا ہے۔ (اللہ نے اسے) کس چیز سے بنایا، نطفہ سے اسے بنایا۔ پھر اس کا اندازہ مقرر کیا، پھر اس کے لئے راستہ آسان کر دیا۔ پھر اس کو موت دی، سو اسے قبر میں پہنچا دیا۔ پھر وہ جب چاہے گا، اسے اُٹھا کھڑا کرے گا۔ کچھ شک نہیں کہ اسے جو حکم دیا گیا، اس نے اس پر عمل نہ کیا تو انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے کی

طرف نظر کرے۔ بے شک ہم نے فراوانی سے پانی برسایا، پھر ہم ہی نے زمین کو اچھی طرح پھاڑا۔ پھر ہم نے اس میں اناج اُگایا، انگور اور ترکاری، اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے باغات اور میوے اور چارہ" (سورۃ عبس: 31-17)۔

ایک منفرد انداز میں قرآنِ پاک، ایک مخصوص قافیہ بندی میں آگے بڑھتا ہے اور پھر انتہائی روانی سے ایک اور قافیہ اختیار کرلیتا ہے۔ تو جیسا کہ درج ذیل آیتِ کریمہ میں ﴿**فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ (8) فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ (9) عَلَى الْكَافِرِينَ غَيْرُ يَسِيرٍ**﴾ " پھر جب صور پھُونکا جائے گا تو وہ دن مشکل کا دن ہو گا۔ کافروں پر آسان نہ ہو گا" (سورۃ المدثر: 8-10)، قرآن ایک قافیہ بندی اختیار کرتا ہے لیکن اس کے فوراً بعد کی آیت میں ایک نئی قافیہ بندی کرتے ہوئے پچھلے ترنم کو ترک کر دیتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿**ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا (11) وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا (12) وَبَنِينَ شُهُودًا (13) وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا (14) ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ (15) كَلَّا ۖ إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا (16) سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا**﴾ "ہمیں اُن سے نمٹ لینے دو جسے ہم نے اکیلے ہی پیدا کیا اور میں نے اسے مالِ کثیر دیا اور (ہر وقت اس کے پاس) حاضر رہنے والے بیٹے دیے اور ہر طرح کے مال میں وسعت دی، پھر بھی لالچ رکھتا ہے کہ میں مزید اور دوں، نہیں بلکہ وہ ہماری آیتوں (نشانیوں) کو جُھٹلاتا رہا ہے، جلد ہی ہم اُسے صعود پر چڑھائیں گے" (سورۃ المدثر: 11-17)۔ پھر قرآن فوراً ہی اس کے بعد والی آیت میں اور طرز میں بدل جاتا ہے: ﴿**إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ (18) فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (19) ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ (20) ثُمَّ نَظَرَ (21) ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (22) ثُمَّ أَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ**﴾ "یقیناً اس نے غور و فکر کیا اور ایک بات ٹھہرالی تو پھر وہ مارا جائے کہ اس نے کیسی بات ٹھہرالی۔ پھر اُس نے تامل کیا، پھر تیوری چڑھائی اور منہ بِگاڑا۔ پھر پیٹھ پھیر کر چلا اور تکبّر کیا" (سورۃ المدثر: 23-18)۔

درحقیقت، قرآنِ پاک نے ہر زمانے کے عربی زبان کے ماہرین کو حیرت زدہ کیا۔ یہ انسانوں کی لسانی ساخت سے مشابہت تو رکھتا ہے مگر یہ انہی اقسام میں ایسا بے مثل ہے کہ یہ اُن تمام لوگوں کو مایوس کر دیتا ہے جنہوں نے اس جیسا بنانے کی کوشش کی، بلکہ قابل ترین لوگوں نے تو کوشش کرنے کی جرأت ہی نہیں کی۔

قرآنِ پاک میں عبارت اور ادبی ساخت کا امتزاج

بے شک قرآن کے اسلوب میں وہ وضاحت، قوت اور جمال ہے جس کا مقابلہ انسان نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ اس کی عبارت گوئی ایسی ہے جس کا اختصار، طُول اور نظم پوری انسانیت کے لئے بے مثل ہے۔ قرآنِ کریم ادبی ساخت میں معانی، مفہوم اور تکرار کو ایک ساتھ انتہائی حیرت انگیز امتزاج سے جمع کرتا ہے۔

جہاں لطیف معانی مطلوب ہوں، تو قرآن میں نرم لہجے والے جملوں میں باریک آواز والے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿**إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا (31) حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا (32) وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا (33) وَكَأْسًا دِهَاقًا**﴾ "بے شک پرہیزگاروں کے لئے کامیابی ہے، باغات اور انگور۔ اور ہم عمر اور جوان عورتیں، اور شراب کے چھلکتے ہوئے جام" (سورۃ النبأ: 34-31)۔

جہاں معانی میں جَزْل مطلوب ہو تو قرآنِ پاک میں زبردست اور بھاری بھرکم (فَخْم) الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿**إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا (21) لِلطَّاغِينَ مَآبًا (22) لَابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا (23) لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا (24) إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا (25) جَزَاءً وِفَاقًا**﴾ "بے شک جہنم گھات میں ہے، سرکشوں کے لئے ٹھکانہ ہے۔ (وہ) اس میں مُدتوں پڑے رہیں گے، نہ ہی ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ ہی کچھ پینا نصیب ہوگا مگر کھولتا ہوا پانی اور بدبودار پیپ۔ یہ (اُن کے اعمال کا) پُورا پُورا بدلہ ہے" (سورۃ النبأ: 26-21)۔

معانی، ایسے اظہارِ بیان کے ساتھ وارد ہوئے ہیں جو مفہوم کی اثر انگیزی کو بڑھاوا دے دیتے ہیں، ایک ایسے ادبی انداز کے ذریعے کہ جس کا ترنم دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک اپنے سننے والے میں اتنے طاقتور جذبات بھڑکاتا ہے۔ جو عربی معانی کی سمجھ رکھتے ہیں، قرآن اپنی فصاحت و بلاغت کے ساتھ معنی کی سمجھ میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ انسان کو ایسے حیران اور مغلوب کر دیتا ہے کہ عربوں کے اولین دور کے کچھ ماہرینِ لسانیات اپنے کفر پر اٹل ہونے کے باوجود اس کی برتری اور عظمت کا انکار نہ کر سکے۔

الفاظ اور جملوں میں حروف اور ان کی آوازوں کا ٹھیک ٹھیک دھیان رکھنا

حُرُوف تہجی کو اکٹھا مرتب کرتے وقت قرآنِ پاک میں ان حروف سے پیدا ہونے والی آوازوں کا بے عیب دھیان رکھا گیا ہے۔

مخارج، حروفِ تہجی کے ادائیگی کے لئے نکلنے والی آواز کا مقام یا جگہ ہیں۔ ان کا تعین منہ، ناک یا حلق کی حرکت کے مطابق کیا جاتا ہے کہ جہاں سے حرف کی آواز نکلتی ہے۔ مخارج، اعضائے تلاوت کی درست جگہ بیان کرتے ہیں تا کہ ایک حرف دوسروں سے ممتاز ہو۔ قرآن مجید کی تجوید کے لئے مخارج کا درست استعمال بہت ضروری ہے۔

قرآن پاک میں ایک لفظ یا جملے میں وہ حروف ایک دوسرے کے قریب رکھے گئے ہیں جو تلفظ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ لہٰذا اس آیتِ مبارکہ میں، ﴿ **أو كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ** ﴾ "یا جیسے آسمان سے مینہ برس رہا ہو" (سورۃ البقرۃ: 19)، قرآن نے یہ نہیں کہا، كالباعِق المُتَدَفِّق "جیسے لگاتار بارش" بلکہ یہ کہا ہے، " **كَصَيِّبٍ، " زور کی بارش"** ۔ قرآنِ پاک میں ہے کہ، ﴿ **عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ** ﴾ "اُن (کے بدن) پر باریک ریشم کے سبز اور اطلس کے کپڑے ہوں گے" (سورۃ الانسان: 21)۔ یہاں پر **سُنْدُسٍ خُضْرٌ** استعمال ہوا ہے، بجائے اس کے کہ **الهُعْخع** استعمال ہوتا، جو معنی میں تو اس کے مساوی ہے لیکن تلفظ میں اس کے قریب نہیں ہے۔

جہاں حروف کے تلفظ کے مقامات کے درمیان فاصلہ ہو تو اس کے درمیان حروف لائے گئے ہیں جو تغیر میں سلیقہ کی عدم موجودگی کو ختم کرتا ہے۔ جہاں حروف کے درمیان تلفظ کی وجہ سے دوری ضروری ہو، تو یہ اس کے مفہوم کو سمجھانے کے لئے موزوں ترین حروف کے استعمال سے کیا گیا ہے اور قرآنِ پاک میں ایسا انتہائی باریکی سے ہوا ہے۔

جیسا کہ قرآن میں ہے : ﴿تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ﴾ "یہ تو پھر بڑی بے انصافی کی تقسیم ہوئی" (سورۃ النجم : 22)۔ قرآن میں لفظ، **ضِيزَى**، استعمال ہوا ہے نہ کہ اس کے مترادف الفاظ، ظَالِمَة اور جائِرٌ ۔

تلفظ کی باریکی کے ساتھ ساتھ قرآن مجید عبارت میں ایک مخصوص حرف کو خوشگوار اور سننے میں ہلکا بناتا ہے جو جب دُہرائے جاتے ہیں تو لگتا ہے جیسے شاعری پڑھتے ہوئے ردیف ہم آہنگ ہوں۔ جو حروف ردیف کے سے اثرات پیدا کریں، آیات میں واضح طور پر کثرت سے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر آیت الکرسی : ﴿**اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ۖ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ**﴾ "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ زندہ ہے ہمیشہ رہنے والا ہے۔ اسے نہ اُونگھ آتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں میں اور جو زمین میں ہے سب اُسی کا ہے، کون ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس سے (کسی کی) سفارش کر سکے، وہ سب حالات جانتا ہے جو موجودہ ہیں اور جو کچھ گزر چکے ہیں، اور وہ اسکے علم میں سے کسی شے پر دسترس حاصل نہیں کر سکتے مگر جس قدر وہ چاہے، اُسی کی بادشاہی (کرسی) نے آسمانوں اور زمین کو گھیرے میں لے رکھا ہے اور اُس پر ان کی حفاظت کچھ دُشوار نہیں، اور وہ عالیشان اور عظیم الشان ہے" (سورۃ البقرۃ: 255)۔

آیت الکرسی میں حرف، "ل"، 23 مرتبہ ایسے خوشگوار اور ہم آہنگ انداز سے دُہرایا گیا ہے جو سُننے والے کو بار بار سننے پر مجبور کرتا ہے۔

آج کے دور کا چیلنج

بے شک، قرآن مجید نوعِ انسانی کے لئے ایک منفرد اور لاثانی کلام ہے۔ یہ معجزہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو ثابت کرنے کے لئے چیلنج کے طور پر نازل ہوا ہے۔

قرآن کی ترکیب 23 سال تک عربوں کے لئے زبردست حیرانی کا باعث رہی۔ چیلنج کو پورا کرنے سے عاجز ہونے پر اُنہوں نے بہتان، دھمکی، جنگ اور جلاوطنی کا سہارا لیا۔ امام باقلانی بیان کرتے ہیں: وقال غير هؤلاء وهؤلاء: لو نشاء لقلنا مثل هذا. ولكنهم لم يقولوا هم ولا غيرهم لان تأليف القرآن البديع، ووصفهالغريب، ونظمه العجيب، قد أخذ عليهم منافذ البيان كلها وقطع أطماعهم في معارضته، فظلوا مقموعين مدحورين ثلاثة وعشرين عاما، يتجرعون مرارة الاخفاق، ويهطعون لقوارع التبكيت، وينغضون رؤوسهم تحت مقارع التحدي والتعيير، مع أنفتهم وعزتهم، واستكمال عدتهم وكثرة خطبائهم وشعرائهم، وشيوع البلاغة فيهم، والتهاب قلوبهم بنار عداوته، وترادف الحوافز إلى مناهضته، وعرفانهم أن معارضته بسورة واحدة أو آيات يسيرة أنقض لقوله، وأفعل في إطفاء أمره، وأنجع في تحطيم دعوته، وتفريق الناس عنه - من مناجزته، ونصبهم الحرب له، وإخطارهم بأرواحهم وأموالهم، وخروجهم عن أوطانهم وديارهم، "جبکہ کچھ دوسروں نے کہا کہ کاش ہم اس سے ملتا جلتا کچھ تو بیان کر سکیں، تاہم قرآن کی شاندار ہیئت، اس کی غیر معمولی خصوصیت اور اس کی حیران کن ترتیب کی وجہ سے، نہ ہی وہ کچھ کہہ سکے اور نہ ہی ان کے علاوہ اور لوگ۔ اس (قرآن) نے ہر طرح کے اظہار میں اُن کو زیر کر دیا اور اس کی مخالفت کے ان کے عزائم کو دبا دیا۔ وہ تئیس سال تک شکست خوردہ رہے، ناکامی میں ڈوبے رہے، قرآن کے چیلنج کے سامنے ان کے سر جھکے رہے۔ ان کے اعلیٰ خاندان اور تکبر، تعداد میں بھی کم نہ ہونا، ان کے مبلغین اور شاعروں کی کثرت، اُن میں چار سو پھیلی ہوئی فصاحت و بلاغت، ان کے دلوں میں بھڑکتی دشمنی کی آگ اور آپ ﷺ کی مخالفت کے مقاصد کے جمع ہونے کے باوجود یہی معاملہ رہا۔ یہ سب ان کے علم میں تھا کہ کسی ایک سورت یا چند آیات سے آپ ﷺ کی مخالفت کرنا آپ ﷺ کے کہے کی تردید کر دے گا۔ اس طرح کی مخالفت آپ ﷺ کے معاملہ کو ختم کرنے، آپ کی دعوت کو تباہ کرنے اور لوگوں کو آپ ﷺ سے علیحدہ کرنے میں اس سے زیادہ کارگر ہوتا کہ مسلمانوں کے سامنے ڈٹا جائے، ان سے جنگ کی جائے، جان و مال کی دھمکیاں دی جائیں، گھروں سے بے دخل یا جلاوطن کر دیا جائے"۔

مزید برآں، قرآنِ مجید کا چیلنج صرف اُنہی لوگوں تک ہی مخصوص نہیں ہے جن سے قرآن نے براہِ راست، محمد ﷺ کے دور میں، نزول کے وقت خطاب کیا تھا۔ یہ ایک دائمی چیلنج ہے جو قیامت تک کے لئے رکھا گیا ہے۔ یہ اس اصول کے سبب ہے: الْعِبْرَةُ بِعُمُومِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوصِ السَّبَبِ " اعتبار، متن کے عمومی ہونے کا ہے، سبب کے خاص ہونے کا نہیں"۔ قرآنِ کریم نے پہلے دور میں عرب اشرافیہ کو ان کی عداوت کے باوجود الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ آج یہ دشمن مغربی حکومتوں کو پریشان کر رہا ہے۔ بالکل زمانۂ جاہلیت کے عربوں کی طرح، مغربی حکومتیں بھی، حق کو ثابت کرنے والے اس کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں ناکامی پر اس کے پیغام کو دبانے کے لئے بہتان، دھمکیوں اور جنگ کا سہارا لے رہی ہیں۔

فہرست

حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ

الوعی شمارہ 421، سے ترجمہ

حاطب بن ابی بلتعہ بن عمرو بن عمیر بن سلمہ اللخمی رضی اللہ عنہ ایک بدری صحابی تھے۔ وہ اسلام میں داخل ہوئے اور مسلمانوں کے ساتھ سعد بن خولی کے ہمراہ، جو حطیب کے حلیف تھے، یثرب کی طرف ہجرت کی۔ وہ منذر بن محمد بن عقبہ کے گھر آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب اور رحیلہ بن خالد کے درمیان بھائی چارہ کر دیا۔ حاطب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان تمام جنگوں میں حصہ لیا تھا جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت کی تھی۔ آپ نے جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق، معاہدہ حدیبیہ اور مکہ کی فتح دیکھی۔ نیز، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے چھٹے سال میں آپ کو مصر کے بادشاہ مقوقس کے نام ایک خط کے ساتھ بھیجا، جس میں اسے اسلام کی طرف دعوت دی گئی تھی۔ مقوقس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفے کے طور پر ماریہ اور ان کی بہن سیرین کو واپس کر دیا۔

بدر کے دن جب حاطب بن ابی بلتعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اعلان کرتے ہوئے سنا کہ "یہ قریش کا قافلہ ہے جس کے پاس ان کا مال ہے، تم ان کی طرف بڑھو، اللہ اسے تمہاری طرف منتقل کرے"۔ حاطب رضی اللہ عنہ نے پکار پر لبیک کہا اور اپنی تلوار نکال لی۔ جب بدر میں دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو حاطب کو اچھی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ احد کے دن حاطب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ثابت قدم رہے جب لوگ بے نقاب ہوئے۔ آپ اور بعض دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع شروع کر دیا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دفاع میں جان دینے کا عہد کیا۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے جنگ خندق کا وقت بھی دیکھا۔

ان کے بارے میں حدیبیہ کے دن کے حوالے سے ایک روایت ہے: محمد بن اسحاق کہتے ہیں: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کی طرف کوچ کرنے کے لیے جمع ہوئے تو حاطب بن ابی بلتعہ نے قریش کو ایک خط لکھا، جس میں انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش قدمی کرنے کی اطلاع دی۔ حاطب نے پھر وہ خط ایک عورت کو دیا، محمد بن جعفر نے دعویٰ کیا کہ وہ عورت ایک حجام تھی، اور دوسروں نے مجھ سے (ابن اسحاق) دعویٰ کیا کہ وہ سارہ ہیں، جو بنو عبدالمطلب میں سے بعض کی حلیف تھی۔ حاطب نے اسے قریش تک پہنچانے کے لیے وہ خط دیا۔ اس نے وہ خط اپنے بالوں میں ڈالا اور پھر بالوں کو ڈھانپ کر اسے چھپا لیا اور پھر وہ چلی گئی۔ حاطب نے جو کچھ کیا تھا اس کی خبر وحی کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔

بخاری نے عبید اللہ بن ابی رافع سے روایت کی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے علی رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے، زبیر اور مقداد کو یہ کہتے ہوئے کہیں بھیجا تھا، **انْطَلِقُوا حَتَّى تَأْتُوا رَوْضَةَ خَاخٍ فَإِنَّ بِهَا ظَعِينَةً مَعَهَا كِتَابٌ فَخُذُوهُ مِنْهَا "جاؤ یہاں تک کہ تم لوگ روضہ خاخ پر پہنچ جاؤ تو وہاں ایک بڑھیا عورت تمہیں ملے گی اور اس کے پاس ایک خط ہو گا' تم لوگ اس سے وہ خط لے لینا"**۔ ہم روانہ ہوئے اور ہمارے گھوڑے ہمیں تیزی کے ساتھ لیے جا رہے تھے۔ آخر ہم روضہ خاخ پر پہنچ گئے اور وہاں واقعی ایک بوڑھی عورت موجود تھی جو اونٹ پر سوار تھی۔ ہم نے اس سے کہا کہ خط نکالو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس تو کوئی خط نہیں۔ لیکن جب ہم نے اسے دھمکی دی کہ اگر تم نے خط نہ نکالا تو تمہارے کپڑے ہم خود اتار دیں گے۔ اس پر اس نے اپنی گندھی ہوئی چوٹی کے اندر سے خط نکال کر دیا' اور ہم اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے کر حاضر ہوئے' اس کا مضمون یہ تھا' حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف سے مشرکین مکہ کے چند آدمیوں کی طرف' اس میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض بھیدوں کی خبر دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **(یا حاطب ما هذا؟) "اے حاطب! یہ کیا ہے؟"** انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرے بارے میں عجلت سے کام نہ لیجئے۔ میری حیثیت (مکہ میں) یہ تھی کہ قریش کے ساتھ میں نے رہنا سہنا اختیار کر لیا تھا' لیکن ان سے میرا کوئی رشتہ

ناتہ نہ تھا۔ آپ کے ساتھ جو دوسرے مہاجرین ہیں ان کی تو مکہ میں رشتہ داری ہے اور مکہ والے اسی وجہ سے ان کے عزیزوں کی اور ان کے مالوں کی حفاظت و حمایت کریں گے مگر مکہ والوں کے ساتھ میرا کوئی نسبی تعلق نہیں ہے' اس لیے میں نے سوچا کہ ان پر کوئی احسان کر دوں جس سے اثر لے کر وہ میرے بھی عزیزوں کی مکہ میں حفاظت کریں۔ میں نے یہ کام کفر یا ارتداد کی وجہ سے ہر گز نہیں کیا ہے اور نہ اسلام کے بعد کفر سے خوش ہو کر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: **(أما إنه قد صَدَقكم) "حاطب نے تم سے سچ کہا ہے"**۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول اللہ! اجازت دیجئے میں اس منافق کا سر اڑا دوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **د شهد بدرًا، وما يدريك لعل الله قد اطَّلَعَ اللَّهُ عَلَى أَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ "یہ بدر کی لڑائی میں (مسلمانوں کے ساتھ مل کر) لڑے ہیں اور کیا معلوم، اللہ تعالیٰ نے مجاہدینِ بدر پر نظرِ کرم کی ہو اور کہا ہو کہ تم جو چاہو کرو میں تمہیں معاف کر چکا ہوں"**۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ ممتحنہ نازل فرمائی: **يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَتَّخِذُواْ عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمۡ أَوۡلِيَآءَ تُلۡقُونَ إِلَيۡهِم بِٱلۡمَوَدَّةِ وَقَدۡ كَفَرُواْ بِمَا جَآءَكُم مِّنَ ٱلۡحَقِّ يُخۡرِجُونَ ٱلرَّسُولَ وَإِيَّاكُمۡ أَن تُؤۡمِنُواْ بِٱللَّهِ رَبِّكُمۡ إِن كُنتُمۡ خَرَجۡتُمۡ جِهَٰدٗا فِي سَبِيلِي وَٱبۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِيۚ تُسِرُّونَ إِلَيۡهِم بِٱلۡمَوَدَّةِ وَأَنَا۠ أَعۡلَمُ بِمَآ أَخۡفَيۡتُمۡ وَمَآ أَعۡلَنتُمۡۚ وَمَن يَفۡعَلۡهُ مِنكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ ٱلسَّبِيلِ** "اے ایمان والو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ کہ ان کے پاس دوستی کے پیغام بھیجتے ہو حالانکہ تمہارے پاس جو سچا دین آیا ہے اس کے یہ منکر ہو چکے ہیں، رسول کو اور تمہیں اس بات پر نکالتے ہیں کہ تم اللہ اپنے رب پر ایمان لائے ہو، اگر تم جہاد کے لیے میری راہ میں اور میری رضا جوئی کے لیے نکلے ہو تو ان کو دوست نہ بناؤ، تم ان کے پاس پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو حالانکہ میں خوب جانتا ہوں جو کچھ تم مخفی اور ظاہر کرتے ہو اور جس نے تم میں سے یہ کام کیا تو وہ سیدھے راستے سے بہک گیا" [سورۃ ممتحنہ: 1].

سُہیلی نے کہا کہ حاطب کے خط میں لکھا تھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک لشکر کے ساتھ تمہاری طرف آ رہے ہیں جیسے ایک رات جو طوفان کی طرح چلتی ہے۔ اللہ کی قسم اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے بھی تمہاری طرف کوچ کریں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں تم پر فتح دے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کیا ہے وہ اسے پورا کرے گا۔ ابن سلام کی

تفسیر میں ہے کہ حاطب نے لکھا تھا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کوچ کر لیا ہے، شاید یہ آپ کی طرف ہو یا کسی اور کی طرف بھی ہو سکتا ہے، لہٰذا ہوشیار رہو۔

حاطب بن ابی بلتعہ، مصر کے حاکم مقوقس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایلچی

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ساتھ حدیبیہ کا معاہدہ کر لیا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش نہیں رہے۔ اللہ عزوجل نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیغام پہنچانے کا حکم دیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بادشاہوں اور حکمرانوں کے پاس قاصد بھیجے۔ آپ ﷺ نے قیصر، خسرو اور نجاشی کے پاس قاصد بھیجے... جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصر بھیجنے کا ارادہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **أيها الناس، أيُّكم ينطلق بكتابي هذا إلى صاحب مصر وأجره على الله؟ "اے لوگو! تم میں سے کون میرا خط لے کر مصر کے حاکم کے پاس جائے گا، اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے؟"**۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے اچھل کر کہا: میں ہوں یا رسول اللہ ﷺ! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **بارك الله فيك يا حاطب "اے حاطب، اللہ تمہیں برکت دے"**۔ حاطب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر مصر کا سفر شروع کیا۔ وہ مصر کا راستہ جانتے تھے، کیونکہ وہ پہلے بھی کئی بار تجارت کی غرض سے مصر کا سفر کر چکے تھے۔ خط جو رتیج بن مینا کو بھیجا گیا جو مصری تھا۔ تاہم، وہ ہرقولیس کی طرف سے مصر پر حکومت کرتا تھا۔ وہ ٹیکس وصول کر کے قسطنطنیہ بھیجتا تھا۔ اسکندریہ اس کا دارالحکومت تھا۔

حاطب بن ابی بلتعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خط مقوقس کو پیش کیا۔ خط میں لکھا تھا: **بسم الله الرحمن الرحيم، من محمد بن عبد الله إلى المقوقس عظيم القبط، سلام على من اتبع الهدى... أما بعد، فإني أدعوك بدعاية الإسلام، أسلم تسلم يؤتك الله أجرك مرتين، فإن تولَّيْتَ فإنَّما عليك إثم القبط، (قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا**

بَعۡضًا أَرۡبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِۚ فَإِن تَوَلَّوۡاْ فَقُولُواْ ٱشۡهَدُواْ بِأَنَّا مُسۡلِمُون)"اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ محمد بن عبداللہ کی طرف سے، مصر کے عظیم قبطی مقوقس کو: سلام ہو اس پر جو ہدایت یافتہ راستے پر چلے! اور اس کے بعد میں تمہیں اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام قبول کرو اور محفوظ رہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے اجر کو دوگنا کر دے گا۔ لیکن اگر تم منہ موڑو گے تو مصریوں کا قصور تم پر ہو گا۔' کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے اس کی طرف آؤ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے اگر یہ لوگ (اس بات کو) نہ مانیں تو (ان سے) کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم (خدا کے) فرماں بردار ہیں' [آلِ عمران 3:64]"۔

مقوقس نے حاطب بن ابی بلتعہ کی طرف دیکھا اور پوچھا: "اگر وہ نبی ہے تو اسے کس چیز نے روکا کہ وہ ان لوگوں کے خلاف (اللہ سے) دعا کریں جنہوں نے اس کی مخالفت کی اور اسے اس کی سرزمین سے نکال دیا؟"۔ حاطب خاموش رہے اور جوریج بن مینا (مقوقس) نے سوال دہرایا، جب اس نے اپنے ارد گرد موجود لوگوں کی رضامندی دیکھی اور پوچھا: "اسے کس چیز نے روکا کہ اگر وہ نبی ہیں تو مخالفت کرنے والوں کے خلاف پکاریں، جنھوں نے اسے اس کی سرزمین سے کسی دوسرے ملک میں نکال دیا، تاکہ ان پر قابو پا سکیں؟"۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے جواب دیا: "کیا تم گواہ ہو کہ عیسیٰ بن مریمؑ اللہ کے رسول ہیں؟"۔ مقوقس نے کہا: "ہاں"۔ حاطب بن ابی بلتعہ نے کہا: "تب کیا معاملہ تھا جب ان کی قوم انھیں سولی پر چڑھانا چاہتی تھی؟ انھوں نے اللہ سے ان کے خلاف دعا نہ کی یہاں تک کہ اللہ نے ان کو اٹھا لیا"۔ مقوقس نے تعریف کے ساتھ سر ہلایا اور کہا: "شاباش، آپ عقلمند ہیں۔ اور یہ پیغام عقلمندوں کی طرف سے ہے"۔

حاطب بن ابی بلتعہ نے کہا: "تم سے پہلے ایک شخص تھا جس نے اپنے آپ کو سب سے بڑا رب کہا، تو اللہ نے اسے دنیا اور آخرت دونوں میں عذاب دیا۔ آپ کو اس کی مثال پر دھیان دینا چاہیے تاکہ آپ خود بھی عبرت کی کہانی نہ بن جائیں"۔ حاطب کی مراد فرعون تھا جو موسیٰ علیہ السلام اور بنو اسرائیل کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ چنانچہ کلیم اللہ (موسیٰؑ) اور بنو

اسرائیل فتح یاب ہوئے اور فرعون اور اس کے ساتھی غرق ہو گئے۔ مقوقس نے حیرانی سے حاطب کی طرف دیکھا اور وہاں موجود لوگوں کی آنکھوں میں سوال ابھرے: اس عربی کو اتنا علم کہاں سے ملا؟ چنانچہ حاطب نے مزید کہا: "یہ نبی لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ جو لوگ ان کی سب سے زیادہ مخالفت کرتے ہیں وہ قریش ہیں، ان کی سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی ہیں اور جو ان کے قریب ترین ہیں وہ عیسائی ہیں یعنی وہ جو ان کی نبوت پر ایمان لانے والے ہیں۔ میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ عیسیٰ (علیہ السلام) محمد ﷺ کی بشارت لے کر آئے تھے اور یہ اس سے بالکل مختلف نہیں ہے کہ موسیٰؑ نے عیسیٰؑ کی بشارت دی تھی۔ ہماری آپ کو قرآن کی دعوت ایسے ہی ہے جیسے آپ تورات والوں کو انجیل کی طرف بلا رہے ہیں"۔

مقوقس نے کہا: "میں نے اس نبی کے بارے میں سوچا ہے۔ وہ دنیا کو ایک طرف چھوڑنے کی تبلیغ نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اچھی چیز سے دور رہنے کا حکم دیتا ہے۔ میں اسے گمراہ کرنے والا کوئی جادوگر یا کوئی جھوٹا جادوگر نہیں سمجھتا۔ میں اس میں نبوت کی نشانیاں دیکھتا ہوں جو پوشیدہ رازوں کی خبر دیتا ہے۔ لیکن مجھے غور کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا"۔ اس کے بعد، مقوقس نے ایک خط لکھا جس میں لکھا تھا: "اللہ کے نام سے، جو سب سے نہایت رحم کرنے والا ہے، قبطی حاکم مقوقس کی طرف سے عبداللہ کے بیٹے محمد کی جانب: السلام علیکم۔ اس کے بعد... میں نے آپ کا خط پڑھا ہے اور میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ نے مجھے کس چیز کی دعوت دی ہے! میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ایک رسول آنے والا ہے۔ لیکن میں نے سوچا تھا کہ وہ شام میں نظر آئے گا۔ میں نے آپ کے ایلچی کے ساتھ حسن سلوک کیا ہے۔ اور میں آپ کے پاس دو غلام بھیج رہا ہوں جو قبطیوں کے پاس سب سے زیادہ عزت دار ہیں، اور میں آپ کو سواری کے لیے ایک خچر دے رہا ہوں۔ آپ پر سلامتی ہو"۔

حاطب کی وفات مدینہ منورہ میں 30 ہجری میں ہوئی جب ان کی عمر 65 سال تھی۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ حاطب جہنم میں نہیں جائے گا۔ حاطب بن ابی بلتعہ کا ایک خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاطب کی شکایت کرنے آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ ﷺ! حاطب یقیناً جہنم میں جائے گا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **كَذَبْتَ لاَ يَدْخُلُهَا فَإِنَّهُ شَهِدَ بَدْرًا**

وَالْحُدَيْبِيَةَ "تم نے جھوٹ بولا۔ وہ یقیناً جہنم میں نہیں جائے گا، کیونکہ اس نے بدر اور حدیبیہ دیکھے ہیں" (مسلم)۔ حاطب سے رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث بھی روایت ہوئی ہے۔ یہ حدیث ان کے دو بیٹوں عبدالرحمٰن بن حاطب، یحییٰ بن حاطب اور عروہ بن زبیر نے روایت کی ہے۔

فہرست

یقیناً خالد بن ولیدؓ مسلم فوجی افسران کے لیے ایک نمونہ اور مثال ہیں کہ کس طرح انہوں نے عظیم دینِ اسلام اور اس کی معززامت کا ساتھ دیا

بلال المہاجر - پاکستان

خالد بن الولید بن المغیرہؓ کا اسلام میں داخل ہونا، اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان کی غیر متزلزل حمایت، ایک بہادر جنگجو کی جانب سے دانشمندانہ انتخاب کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ ایک فوجی ہیرو کا اصولی موقف تھا جو کبھی بھی کسی جنگ میں نہیں ہارا تھا۔ اگر وہ اپنے کفر پر قائم رہتے اور اسی طرح مر جاتے جیسے اُن کے آباء واجداد اور کفار میں سے اُن کے ہم عصر ایمان لائے بغیر اس دنیا سے چلے گئے تھے، جیسے کہ ابو جہل اور الولید ابن المغیرہ، تو خالد بن ولید کا شمار بھی اُن لوگوں میں ہی ہوتا جنہوں نے دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں نقصان اٹھایا۔

در حقیقت، خالدؓ کی زندگی موجودہ مسلم افواج کے افسران کے لیے ایک زبردست اور شاندار مثال، نمونہ اور سبق ہے، جنہیں اُس وقت کے ظالموں کی حکمرانی کی حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا، تاکہ وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کی جگہ کفر کی بنیاد پر حکمرانی جاری رکھ سکیں۔ اگر آج ہمارے محترم فوجی افسران خالد بن الولیدؓ کی مثال پر عمل کریں تو ان کے معاملات کا انجام وہی ہوگا جیسا کہ اللہ کی تلوار، سیف اللہ، کا ہوا تھا، ان شاء اللہ۔ چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ نے اجازت دی تو ایسے افسران ایک خوشی کا دن دیکھیں گے جس میں وہ خالدؓ اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ ہمارے آقا محمد مصطفیٰ ﷺ کے حوض پر جمع ہوں گے۔ اور وہ کیا ہی خوشی کا دن ہوگا!

تاہم، اگر مسلم فوجی افسران اِس عظیم مقام کی جگہ ذلت کی پستیوں کا انتخاب کرتے ہیں اور مسلم دنیا میں موجودہ سیکولر حکومتوں کی حفاظت کو اپنی حقیقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے اِن قومی ریاستوں کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں جو مسلمانوں کو کمزور کرنے اور ان کو تقسیم کرنے کے لیے خلافت کی سرزمین پر بنائی گئی تھیں، تو اُن کے لیے اِس

عمل کے سنگین اور افسوسناک نتائج برآمد ہوں گے۔ درحقیقت، یہ مسلمان فوجی افسران کا کام نہیں ہے، جن کے دل اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت اور عقیدت سے لبریز ہوں، کہ وہ ظالموں کی حکمرانی کی حفاظت کریں، اپنی فوجی زندگی اِن ظالم حکومتوں کی خدمت میں ضائع کریں جو مغربی صلیبیوں کے ایجنٹ ہیں، اور دشمن کفار کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔ لہٰذا، مسلمان افسران کو ان سیاہ مثالوں سے سبق لینا چاہیے، جو فوجی تاریخ میں بکھری پڑی ہیں، ان لوگوں کی مثالیں جنہوں نے اندھی تقلید کرتے ہوئے ظالم حکمرانوں اور اُن کی حکمرانی کی حفاظت کی اور اسی حال میں مر گئے، جیسے کنگ رچرڈ، شہنشاہ نپولین اور ظالم ہٹلر، اور دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کا نقصان اٹھایا۔ درحقیقت، جہنم غافل لوگوں کے لیے گھات لگا کر بیٹھے ہوئے ایک حملہ آور کی طرح چھپی بیٹھی ہے جو موت کی صورت میں اچانک اُن کے سروں پر پہنچ جائے گی اور جس طرح پھر فرعون کو اپنے برے عمل سے واپس پلٹنے کا موقع نہیں ملا تھا، غافل لوگوں کو بھی نہیں ملے گا۔

خالدؓ کو اسلام اور مسلمانوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ یہ واقعہ اس طرح سے پیش آیا تھا کہ آپؓ کے بھائی، ولید بن ولید بن المغیرہؓ آپؓ کے لیے رسول اللہ ﷺ کا ایک مختصر پیغام آپؓ کے گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ صرف ایک مختصر پیغام تھا جو اُن کے لیے دنیا اور اس کے سامان کا آخرت کی لامتناہی نعمتوں کے بدلے سودا کرنے کے لیے کافی تھا۔ خالد بن ولیدؓ معاہدہ حدیبیہ کے بعد اُس وقت اسلام میں داخل ہوئے جب رسول اللہ ﷺ عمرہ کی ادائیگی کے لیے مکّہ تشریف لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے الولید سے، جو اُس وقت اسلام لا چکے تھے، خالد بن ولید کے متعلق پوچھا، **أين خالد؟ "خالد کہاں ہے؟"** الولیدؓ نے فرمایا، يأتي به الله "اللہ اسے لائے گا۔" رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **ما مثله يجهل الإسلام، ولو كان يجعل نكايته مع المسلمين على المشركين كان خيرا له، ولقدّمناه على غيره "اُس جیسا کوئی نہیں جو اسلام سے بے خبر ہو۔ اگر وہ مسلمانوں کے خلاف اپنے غصے کا رخ مشرکین کی جانب پھیر دے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ یقیناً، ہم اسے دوسروں پر فوقیت دیں گے۔"**

الولیدؓ نے اپنے بھائی کو ڈھونڈا، مگر وہ انہیں نہ ملے، تو انہوں نے خالدؓ کے لیے یہ پیغام چھوڑا، بسم الله الرحمن الرحيم أما بعد: فإني لم أر أعجب من ذهاب رأيك عن الإسلام، وعقلك عقلك! ومِثْلُ الإسلام يَجْهَلُهُ أحد؟! وقد سألني رسول الله صلى الله عليه وسلم عنك، فقال: أين خالد؟ ... فاستدرك يا أخي ما قد فاتك، وقد فاتتك مواطن صالحة " ''بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اما بعد! میں نے اس سے زیادہ تعجب خیز کوئی امر نہیں دیکھا کہ تیری رائے اسلام جیسے پاکیزہ مذہب کے قبول کرنے سے کیوں منحرف ہے، حالانکہ تیری عقل، تیری عقل ہے۔ (جو مشہور و معروف ہے) اور اسلام جیسے پاکیزہ مذہب سے کسی کا بے خبر رہنا تعجب خیز ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمہارا حال دریافت کیا تھا کہ خالد کہاں ہے؟۔۔۔ پس اے بھائی! تجھ سے جو عمدہ مقامات فوت ہو گئے ہیں تو ان کی تلافی اور تدارک کر لے کہ ابھی وقت ہے۔''

اس سے پہلے ہی سے خالدؓ اسلام کے متعلق غور و فکر کر رہے تھے اور جب انہوں نے اپنے بھائی کا پیغام پڑھا تو وہ خوشی سے نہال ہو گئے۔ وہ اپنے متعلق رسول اللہ ﷺ کے بیان سے حیران ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل کو کھول دیا، چنانچہ وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے انہوں نے ایک خواب بھی دیکھا تھا، جس میں وہ ایک تنگ جگہ پر تھے، جہاں سے وہ ایک وسیع، سبز چراگاہ کی طرف نکل آئے۔ جب آپ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ سے اس خواب کا تذکرہ کیا جب وہ مدینہ میں تھے تو انہوں نے فرمایا: هو مخرجُكَ الذي هداك الله للإسلام، والضيقُ الذي كنتَ فيه من الشرك" تمہارا نکلنا اس کی طرف ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہدایت کی ہے، اسلام، جبکہ تم جس تنگی میں تھے وہ شرک تھا۔" اس طرح، ایک مختصر پیغام اور ایک خواب جو انہوں نے دیکھا تھا، وہ ایک حقیقی فوجی لیڈر کے لیے اسلام میں داخل ہونے، اور اپنی زندگی کو درست کرنے، اور وہ کام کرنے کے لیے جس کے لیے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا، کافی ثابت ہوا، یعنی کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی عبادت اور اس کی راہ میں میں جہاد کرنا۔

خالد بن ولیدؓ واقعی ایک تجربہ کار فوجی کمانڈر تھے۔ انہوں نے جنگِ اُحد میں مشرکین کے لشکر کی قیادت کی اور مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ پھر مسلمان ہو جانے کے بعد بھی وہ ایک شاندار کمانڈر رہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کی پہلی فوجی مہم موتہ کی جنگ تھی، جس میں انہوں نے مسلمانوں کا جھنڈا اٹھایا، جس کے بعد انہیں "سیف اللہ" (اللہ کی تلوار) کا خطاب دیا گیا۔ انہوں نے مرتدین کے خلاف جنگوں میں بھی حصہ لیا، اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر سو سے زیادہ جنگیں لڑیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **نِعْمَ عبدُ اللهِ وأخو العَشيرةِ خالدُ بنُ الوليدِ سيفٌ مِن سيوفِ اللهِ سلَّه اللهُ على الكفَّارِ والمنافقين "ہاں، عبداللہ اور قبیلے کے دیگر بھائیوں، خالد بن الولید، اللہ عزوجل کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے جسے اللہ تعالیٰ نے کفار اور منافقوں کے خلاف اتارا ہے۔"**

خالدؓ نے مکّہ کی فتح میں حصہ لیا اور حنین کی جنگ میں بھی شامل تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے آپؐ کو اپنے سر سے ایک بال عطا فرمایا جسے خالدؓ نے اپنی پگڑی (ٹوپی) میں رکھا۔ خالدؓ دشمن کو شکست دیے بغیر نہ رہتے تھے۔ ابو بکر صدیقؓ نے انہیں پوری فوج کا سپہ سالار بنا دیا، جبکہ انہوں نے اور ابو عبیدہؓ نے دمشق کو فتح کیا۔ یہ تمام فتوحات ایک سچے فوجی افسر، جنگجو، کی تھیں، جنہیں عسکری تاریخ میں یاد کیا جاتا ہے، اور جنہیں بہترین امت بنی نوع انسان کی فلاح کے لیے آگے لائی۔ اُن کی فتوحات اُن کے اچھے اعمال کے ترازو میں اُس دن بھاری ہوں گی جس دن نہ پیسہ اور نہ اولاد کوئی فائدہ دے گی۔

خالدؓ کی مثال اُن موجودہ فوجی افسران سے بہت اعلیٰ ہے جو مسلم افواج میں تمغے اور عہدے حاصل کرنے کے لیے خدمات انجام دیتے ہیں اور اسی میں اپنی زندگیاں صرف کر دیتے ہیں، اسلام اور مسلمانوں کی حمایت کے لیے کوئی حقیقی کامیابی حاصل نہیں کرتے لیکن استعماری طاقتوں کے مفادات کے لیے جنگیں لڑتے ہیں، اور صلیبی اقوام متحدہ کے "امن" مشنز میں خدمات انجام دیتے ہیں۔ درحقیقت، کمانڈر خالد بن الولیدؓ اور اُن مرنے والے افسروں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے، جن کی زندگی اور موت، اللہ کی تلوارؓ کی زندگی اور موت سے بالکل مختلف ہے کیونکہ

خالدؓ کی زندگی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے دین کی ترویج، اسلامی سلطنت اور مسلمانوں کے دفاع میں گزری اور اسی حالت میں انہیں موت نصیب ہوئی۔

اصل میں مسلمان فوجی افسران امت کے معزز خادم ہیں۔ وہ اُن کے ایمان کی حفاظت اور اس کے مقدسات کے تحفظ کا عہد کرتے ہیں۔ وہ یقیناً ظالم حکمرانوں کے بندے نہیں ہیں جو اللہ کی نازل کردہ وحی اور اس میں موجود احکامات کے مطابق حکومت نہیں کرتے۔ درحقیقت اصل میں حکمرانوں کو خود بھی عوام کا خادم بننا چاہیے، لیکن اِس کے برخلاف اِن حکمرانوں نے اپنے جمہوری نظام کے ذریعے امانت میں خیانت کی اور عوام کی دولت کو ناجائز طریقے سے ہڑپ کیا۔ جہاں تک فوجی افسران کا تعلق ہے، اگر وہ اپنے اور عوام کے درمیان کیے گئے عہد کو پورا نہیں کرتے تو وہ بھی حرام دولت میں سے کھانے والے اور اپنے بچوں کو بھی کھلانے والے قرار دیے جائیں گے۔ درحقیقت حرام مال صرف وہی نہیں ہے جو چوری یا ڈکیتی سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس شخص کا وہ مال بھی حرام ہو جاتا ہے جسے کسی فرض کے لیے رکھا گیا ہو، لیکن وہ اُس فرض کو پورا نہیں کرتا جس کے لیے اسے رکھا گیا تھا۔ اور ایسا خاص طور پر اُس وقت ہوتا ہے جب عام مسلمان جو کہ حکمرانوں کے ہاتھوں غریب ہو چکے ہیں، لیکن فوجیوں اور افسروں کو ان کی اچھی تنخواہیں بروقت ادا کرنے کے لیے اپنے دکھی خاندانوں کے پیٹ کاٹ رہے ہوں۔ امت یہ سخت قربانی اس لیے نہیں دیتی کہ فوجی افسران اور ان کے اہل خانہ امت کی دولت سے لطف اندوز ہو سکیں جبکہ وہ امت کے لیے کچھ بھی نہ کر رہے ہوں، اور اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ وہ امت کے دشمنوں کی خدمت کر رہے ہوں۔ یہ قربانی امت صرف اس کے دین، اس کی حرمت اور اس کے ناقابل تنسیخ امور کے دفاع کے لیے دیتی ہے۔ اگر مسلمان فوجی افسران اپنے عہد کا احترام نہیں کرتے تو وہ خود کو اور اپنے اہل خانہ کو حرام کھلاتے اور حرام مال سے پالتے ہیں۔

لہٰذا مسلمان افسر حرام سے کھانے سے ہر صورت بچیں۔ جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نبَتَ منَ السُّحْتِ وكلُّ لحمٍ نبَتَ منَ السُّحْتِ كانَتِ النَّارُ أَوْلَى بِهِ "وہ گوشت جس کی پرورش ناجائز مال سے ہوئی ہو جنت میں داخل نہیں ہوگا، بلکہ ناجائز مال پر پرورش پانے والے تمام گوشت کے لیے جہنم زیادہ مناسب ہے۔"** (احمد، دارمی، اور بیہقی)۔ ابو بکر صدیقؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا، **لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِّيَ بالحرَامِ "حرام سے پرورش پانے والا جسم جنت میں داخل نہیں ہوگا، اس کے لیے آگ زیادہ مناسب ہے۔"** (بیہقی شعب الایمان میں)۔ پس جو فوجی افسر اللہ سبحانہ و تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ کیوں اپنے اہل و عیال کی حرام پیسوں سے پرورش کر کے انہیں جہنم کی آگ میں ڈالنے پر راضی ہو سکتا ہے؟! رہی بات ان میں سے جو افسر اس بات پر خوش ہے کہ اس کی اولاد ممتاز ترین یونیورسٹیوں سے بڑھ کر فارغ التحصیل ہوں تاکہ لوگوں کے سامنے اپنی اولاد پر فخر کر سکیں، تو کیا وہ اس بات پر مطمئن ہونا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی اولاد کی اس طرح سے پرورش کی کہ وہ جہنم کی آگ کا ایندھن بن سکیں؟! اللہ سبحانہ و تعالیٰ ایسی صورتحال سے محفوظ رکھے!

یہ بات دوپہر کے سورج کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ امت کی ابتر حالت کو اہل قوت اور محافظوں کی نصرۃ سے ہی بدلا جا سکتا ہے، جبکہ عوام حقیقتاً اُس شے کو بدل چکے ہیں جو اُن کے اندر موجود ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا، **إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ "بیشک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اندر موجود ہر چیز (حالت) نہ بدلیں۔"** (الراد، 13:11)۔ درحقیقت امت نے بارہا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے قانون کے مطابق حکمرانی کا مطالبہ کیا ہے، ننگے سینوں کے ساتھ سڑکوں پر نکل کر کفار کے استعماری نظام کے خاتمے اور اس کے ملبے پر اسلام کی حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا ہے۔ تاہم، جن لوگوں نے امت کو ناکام کیا ہے وہ صرف اور صرف مسلمان افسر اور فوج کے کمانڈر اور ان کی مسلح افواج ہیں جبکہ وہ امت کا حصہ ہیں اور اس کے بیٹوں میں سے ہیں۔ انہوں نے امت کو اس حقیقت کے باوجود ناکام کیا کہ عام مسلمانوں نے ان پر اپنے اہل و عیال کے حق میں سے خرچ کیا ہے۔ اس طرح آج مسلمان افسران جابر، ایجنٹ حکمرانوں کے گناہ اپنے اوپر لے کر اسی طرح کے عذاب کو دعوت دے رہے ہیں جس کا شکار اِن حکمرانوں نے لازمی ہونا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا، **إِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا كَانُوا خَاطِئِينَ "بیشک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر خطاکار تھے۔"** (القصاص، 8:28)۔ مفہوم یہ ہے کہ فاسق و فاجروں میں کفار کا سربراہ فرعون اور اس کا وزیر ہامان اور ان کے لشکر بھی شامل ہیں۔

کسی سپاہی یا افسر کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ حاکم کے ظلم اور کفر سے متعلق اپنی ذمہ داری سے خود کو بری الذمہ قرار دے، یہ دعویٰ کرے کہ وہ حاکم کے جبر، اس کی کفر کی بنیاد پر حکمرانی، کفار کے لیے اس کی خدمات، اس کے کھلے اور واضح گناہ اور اس کی بے حیائی کا ذمہ دار نہیں ہے۔ درحقیقت، رسول اللہ ﷺ نے اُن لوگوں کی مذمت کی ہے جو حاکم کے ظلم کے بارے میں کسی بھی ذمہ داری سے خود کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **اسْمَعُوا هَلْ سَمِعْتُمْ أَنَّهُ سَيَكُونُ بَعْدِي أُمَرَاءُ فَمَنْ دَخَلَ عَلَيْهِمْ فَصَدَّقَهُمْ بِكَذِبِهِمْ وَأَعَانَهُمْ عَلَى ظُلْمِهِمْ فَلَيْسَ مِنِّي وَلَسْتُ مِنْهُ وَلَيْسَ بِوَارِدٍ عَلَيَّ الْحَوْضَ وَمَنْ لَمْ يَدْخُلْ عَلَيْهِمْ وَلَمْ يُعِنْهُمْ عَلَى ظُلْمِهِمْ وَلَمْ يُصَدِّقْهُمْ بِكَذِبِهِمْ فَهُوَ مِنِّي وَأَنَا مِنْهُ وَهُوَ وَارِدٌ عَلَيَّ الْحَوْضَ" سنو: کیا تم لوگوں نے سنا کہ میرے بعد ایسے امراء ہوں گے کہ جو ان کے پاس جائے ان کی جھوٹی باتوں کی تصدیق کرے اور ان کے ظلم پر ان کی مدد کرے، وہ مجھ سے نہیں ہے اور نہ میں اس سے ہوں اور نہ وہ میرے حوض پر آئے گا، اور جو شخص ان کے پاس نہ جائے، ان کے ظلم پر ان کی مدد نہ کرے اور نہ ان کی جھوٹی باتوں کی تصدیق کرے، وہ مجھ سے ہے، اور میں اس سے ہوں اور وہ میرے حوض پر آئے گا۔"** (ترمذی، النسائی، اور احمد)۔

امام ابن حنبلؒ کی قید کے بارے میں روایت ہے کہ ان کے پاس ایک جیلر آیا اور کہنے لگا: الحديث الذي رُوي في الظلمة وأعوانهم هل هو صحيح؟ " کیا ظالموں اور ان کے مددگاروں کے بارے میں جو حدیث مروی ہے وہ صحیح ہے؟" آپؒ نے فرمایا، نعم "ہاں۔" جیلر نے کہا، وأنا من أعوان الظلمة؟ "کیا میں جابروں کی مدد کرنے والوں میں سے ایک ہوں؟" پھر ابن حنبلؒ نے فرمایا، أعوان الظلمة من يأخذ شعرك ويغسل ثوبك ويصلح طعامك ويبيع ويشتري منك أما أنت فمن الظَّلَمَة" ظالموں کے مددگار تو وہ ہیں جو ان کے بال کاٹتے ہیں، ان کے کپڑے دھوتے ہیں، ان کیلئے کھانا تیار کرتے ہیں اور ان سے خرید و فروخت کرتے ہیں۔ جہاں تک تمہارا تعلق ہے تو تم تو خود ظالموں میں سے ہو۔" (مناقب الامام احمد "از ابن الجوزی)۔ اور جب ہم امام احمد پر ظلم کرنے والے کے بارے میں بات کر رہے ہیں تو درحقیقت ہم خلیفہ المامون کے بارے میں

بات کر رہے ہیں، وہ مسلمان حکمران جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے نازل کردہ تمام احکام کے مطابق حکومت کرتا تھا اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا تھا۔ پھر بھی امام احمد نے اس کے بارے میں یہ کہا! ہم مسلمانوں کے موجودہ حکمرانوں کی بات نہیں کر رہے جنہوں نے مسلمانوں کے مقدسات کو پامال کیا، جہاد اور اسلام کے تمام شرعی احکام کو معطل کر دیا ہے۔ یہ اقتدار پر قبضہ کرنے والے، گنہگار، جابر اور ان میں سے اکثر کافر ہیں۔ یہ یقیناً کسی طور پر بھی مامون جیسے نہیں ہیں بلکہ اس زمانے کے فرعون ہیں۔

مسلمان فوجوں میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے عقلمند افسران کو چاہیے کہ وہ اپنے معاملات کو ٹھیک کریں جیسا کہ خالد بن ولیدؓ نے کیا تھا، اس سے پہلے کہ بہت دیر ہو جائے۔ بے شک موت ہر مخلوق کے بہت قریب ہے اور روز جزا (آخرت) لازم وملزوم ہے۔ خالد بن ولیدؓ نے بستر مرگ (موت کے وقت) پر فرمایا: شهدت مئة زحف أو زهاءها، وما في جسمي موضع شبرٍ إلا وفيه ضربة أو طعنة أو رمية، ثم ها أنا ذَا أموت على فراشي كما يموت البعير، فلا نامت أعين الجبناء" میں نے سو جنگیں دیکھی ہیں۔ میرے جسم میں ایک انچ بھی ایسا نہیں جس پر ضرب نہ لگی ہو، زخم یا نشان نہ ہو۔ پھر بھی میں یہاں ہوں، اپنے بستر پر اس طرح مر رہا ہوں جیسے اونٹ مرتا ہے، پس بزدل کبھی سکون کی نیند نہ سوئے" معاملات کی اصلاح صرف ایک چیز سے ممکن ہے جس کا کوئی متبادل نہیں۔ اس کی عدم موجودگی نماز، روزہ، صدقہ، حج یا عمرہ سے پوری نہیں ہوتی۔ فوجی افسر کے لیے اصلاح صرف مسلمانوں کے ساتھ کھڑے ہونے میں ہے، جس کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے احیاء کے منصوبے کے لیے نصرۃ فراہم کرنا ضروری ہے، اسلام کو لوگوں کے لیے نظام حکومت کے طور پر بحال کرنا ضروری ہے، اور اس کا قیام یعنی نبوت کے نقش قدم پر خلافت، حزب التحریر کو نصرۃ دے کر ہوگا، جبکہ خلافت کے قیام کی بشارت رسول اللہ ﷺ بھی دے چکے ہیں۔ اور اگر مسلمان افسران ایسا کرتے ہیں تو دونوں جہانوں میں فتح پائیں گے جیسا کہ خالد بن الولیدؓ نے فتح پائی۔ اور اگر انہوں نے دنیا میں اس کی مخالفت کی تو وہ جہنم میں ہیں، اللہ (عزوجل) اس انجام سے محفوظ رکھے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا، **قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى**

يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ "کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے بند ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو، اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیجے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ "(التوبہ، 9:24)

فہرست

بیوی کیلئے شوہر کی اطاعت کا ثواب مرد کی شہادت کے برابر ہے

یوسف احمد بدرانی کی کتاب "العائلة قلعة" (خاندان ایک قلعہ ہے) سے ماخوذ

جہاں اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے گھریلو زندگی میں مرد کو بیوی کے ساتھ اچھا تعلق نبھانے کا حکم دیا، وہیں عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ بہترین تعلق نبھانے، اس کی اطاعت کرنے اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے مال و اولاد کی حفاظت کرنے کی تاکید فرمائی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا: أي الناس أعظم حقاً على المرأة "عورت پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟"، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **زوجها** "اس کے شوہر کا"۔ میں نے پھر پوچھا: فأيّ الناس أعظم حقّاً على الرجل "مرد پر سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟"، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **أمه** "اس کی ماں کا" (مستدرک)۔ حضرت حصین بن محصن رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کی پھپھی فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئی، تو آپ ﷺ نے مجھ سے پوچھا: **أَذَاتُ زَوْجٍ** "کیا تمھارا شوہر ہے؟"، میں نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ آپ ﷺ نے اس پر فرمایا: **فَأَيْنَ أَنْتِ مِنْهُ** "تم اس سے کیسا سلوک کرتی ہو؟"، اس پر میں نے عرض کیا: مَا آلُوهُ إِلَّا مَا عَجَزْتُ عَنْهُ "میں تو ان کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی ماسوائے یہ کہ میں اس سے عاجز ہوں"، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **انْظُرِي أَيْنَ أَنْتِ مِنْهُ فَإِنَّهُ جَنَّتُكِ وَنَارُكِ** "دھیان رکھو کہ تم اس کے ساتھ کیسی ہو، کیونکہ وہی تمہاری جنت اور وہی تمہاری جہنم ہے" (احمد)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں تشریف لائیں اور پوچھنے لگیں: "یارسول اللہ ﷺ! میں عورتوں کی طرف سے آپ کے پاس قاصدہ بن کر آئی ہوں۔ اللہ نے مردوں پر جہاد کو فرض کیا ہے، پس اگر وہ غازی بن کر لوٹیں تو ان کے لیے بے مثال اجر ہے اور اگر شہید ہو

جائیں تو وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہوں گے اور اپنے رب سے رزق پاتے رہیں گے، لیکن ہم عورتیں ان کے پیچھے (گھریلو) انتظام ہی سنبھالتی ہیں (اس لیے اس اجر سے محروم ہوتی ہیں)۔ تو کیا ہمارے لیے ان کے اجر میں سے کچھ حصہ ہے؟ تو نبی ﷺ نے فرمایا: **أَبْلِغِي مَنْ لَقِيتِ مِنَ النِّسَاءِ أَنَّ طَاعَةَ الزَّوْجِ وَاعْتِرَافًا بِحَقِّهِ يَعْدِلُ ذَلِكَ وَقَلِيلٌ مِنْكُنَّ مَنْ يَفْعَلُهُ** "جن عورتوں سے تم ملو انھیں یہ بتادو کہ شوہر کی اطاعت کرنا اور اس کے حقوق پورے کرنا اس (یعنی اللہ کی راہ میں جہاد اور شہادت) کے برابر ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے بہت کم عورتیں ہی ایسا کرتی ہیں"۔

تو اسلام نے مرد کے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے اور جنگ میں فتح یا شہادت کو بیوی کی فرمانبرداری اور شوہر کے حقوق پورے کرنے کے برابر قرار دیا۔ اس بارے میں ایک لمحے کیلئے بھی یہ سوچنا درست نہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالی نے جنت کے حصول کے معاملے میں عورتوں کو مردوں پر کس قدر فوقیت دی ہے یا ان کے ساتھ کس قدر چھوٹ کا معاملہ فرمایا ہے، جب کہ اس کے برعکس مردوں پر تو جنت کے حصول کے لیے انتہائی سخت شرائط عائد کی ہیں۔ بہر حال یہ ایک الگ موضوع ہے، جو یہاں مقصود نہیں، کیونکہ ہم یہاں عورتوں اور مردوں کی گھریلو زندگی اور اس کی ذمہ داری کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں، آخرت یا جنت کے حصول میں کس کے لیے آسانی اور کس کے لیے مشکلات ہیں، اس بارے میں تفصیلات ایک الگ موضوع ہے۔

بہر حال انسان ایک خاص مقصد کے لیے محدود مدت تک اس زمین پر رہتا ہے۔ نہ مرد نے اپنی ذمہ داری کو ذاتی پسند سے چنا اور نہ ہی عورت نے، بلکہ ان پر یہ ذمہ داریاں اللہ تعالی نے ہی عائد کیں کہ جو لوگ اللہ تعالی کے احکامات پر چلنے کی ٹھان لیں، ان پر یہ احکامات بھی لاگو ہیں، مگر جس نے بھی شیطان مردود کے پیچھے لگ کر اپنی زندگی کی ڈور اس کے ہاتھ میں دے دی تو اللہ تعالی ضرور اسے حساب کے دن سزا و جزا کیلئے پکڑے گا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلالا مُبِينًا﴾** "اور جب اللہ اور اُس کا رسول کسی

بات کا حتمی فیصلہ کردیں تو نہ کسی مومن مرد کیلئے یہ گنجائش ہے، نہ کسی مومن عورت کیلئے کہ اُن کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔ اور جس کسی نے اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کی، وہ کھلی گمراہی میں پڑگیا"(الاحزاب:36)۔

اسلام نے شیطانی ہتھکنڈوں سے عورت کی حفاظت کے پیش نظر اسے شوہر کی نافرمانی کرنے سے منع کیا ہے اور جنت کو شوہر کی اطاعت کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ دَخَلَتِ الْجَنَّةَ** "جس کسی عورت کو اس حال میں موت آئی کہ اس کا شوہر اس سے راضی تھا تو وہ سیدھی جنت جائے گی"(مشکاۃ المصابہ)۔ نیز یہ بھی فرمایا: **الْمَرْأَةُ إِذَا صَلَّتْ خَمْسَهَا وَصَامَتْ شَهْرَهَا وَأَحْصَنَتْ فَرْجَهَا وَأَطَاعَتْ بَعْلَهَا فَلْتَدْخُلْ مِنْ أَيِّ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَاءَتْ** "جس عورت نے پانچ وقت نماز کی پابندی کی، رمضان کے روزوں کا اہتمام کیا، شرمگاہ کی حفاظت کی اور اپنے شوہر کی اطاعت کی تو روز قیامت اس سے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جا"(مشکاۃ المصابہ)۔ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: **أَلَا أخبرُكم بنسائِكُم في الجنَّةِ ؟** "کیا میں تمہیں جنت میں تمہاری بیویوں کے بارے میں نہ بتاؤں کہ وہ کون ہوں گی؟"، ہم نے عرض کیا کہ کیوں نہیں اے اللہ کے رسول ﷺ! پھر نبی ﷺ نے فرمایا: **كُلُّ وَدُودٍ وَلُودٍ ، إِذَا غَضِبَت أَو أُسِيءَ إِلَيهَا أَو غَضِبَ زَوجُهَا ، قَالَت : هَذِه يَدِي فِي يَدِكَ ، لَا أَكْتَحِلُ بِغُمضٍ حتَّى تَرضَى** "ہر وہ بیوی جو دنیا میں اپنے شوہر سے بہت زیادہ محبت کرنے والی، زیادہ بچے جننے والی، جب اس کا شوہر اس سے ناراض ہو جائے یا اس سے برا سلوک کرے یا اس پر غصہ ہو جائے تو وہ اسے منانے کے لیے کہے کہ میرا یہ ہاتھ اب تمہارے ہاتھوں میں ہے، جب تک آپ راضی نہ ہوں گے میں نیند کا مزہ نہیں چکھوں گی"(طبرانی)۔

شوہر کی نافرمانی اللہ کے دین میں گناہِ کبیرہ میں سے ہے

اللہ عزوجل کی طرف سے جنت ومغفرت اور شوہر کی فرمانبرداری کے عظیم اجر کے ساتھ اللہ اور رسول ﷺ نے شوہر کی نافرمانی کے عظیم گناہ کو بھی بیان کیا کہ یہ گناہ جہنم میں لے جانے اور اللہ کے غضب کو دعوت دینے کا سبب ہے۔اس سے اس عورت پر اللہ، رسول ﷺ اور فرشتوں کی لعنت برستی ہے جو اپنے شوہر کی کھلی نافرمانی کرے، بدسلوکی کرے، زبان درازی وبدکلامی کرے، وہ کام کرے جو اس کے شوہر کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں، اس کا مال ضائع کرے، اس کا راز فاش کرے، اس کی غیر موجودگی میں اس کے سامان کی حفاظت نہ کرے، اس کے بستر سے علیحدہ رہے، اس کا کہنا نہ مانے، بات بات پر منہ بنائے اور اسے راضی نہ کرے۔ چنانچہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: **لا ينظُرُ اللَّهُ تبارَك وتعالى إلى امرأةٍ لا تشكُرُ لزوجِها وَهيَ لا تستَغني عنهُ** "اللہ تبارک وتعالی اس عورت پر نظر کرم نہیں فرماتے جو اپنے شوہر کا شکر نہ ادا کرے حالانکہ وہ اس کی محتاج بھی نہ ہو"۔اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **لا تؤذِي امرأةٌ زوجَها في الدنيا ؛ إلا قالت زوجتُه من الحورِ العِينِ : لا تؤذيه قاتلكِ اللهُ ! فإنما هو عندكِ دخيلٌ، يوشِكُ أن يُفارِقَكِ إلينا** "جب بھی دنیا میں کوئی عورت اپنے شوہر کو ایذا پہنچاتی ہے تو اس شخص کی (جنتی بیوی) حورالعین اس عورت سے کہتی ہے: اللہ تجھے برباد کرے اسے ایذا نہ پہنچا کیوں کہ یہ تو تیرے پاس ایک مہمان ہے، قریب ہے کہ یہ تجھے چھوڑ کر میرے پاس آجائے"(مشکاۃ المصابہ)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **إِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ إِلى فِرَاشِهِ، فَلَمْ تَأْتِهِ، فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَيْهَا، لَعَنَتْهَا المَلَائِكَةُ حتَّى تُصْبِحَ** "اگر کوئی آدمی اپنی بیوی کو صحبت کے لیے بلائے اور وہ انکار کرے جس کے نتیجے میں آدمی ساری رات اس پر غصے میں گزارے تو اس عورت پر فرشتے صبح ہونے تک لعنت کرتے ہیں"(مسلم)۔ایک دوسری حدیث میں فرمایا: **والَّذي نفْسي بيدِهِ، ما مِن رَجُلٍ يَدْعو امرأتَهُ إلى فِراشِهِ، فتَأْبَى عليه، إلَّا كان الَّذي في السَّماءِ ساخِطًا عليها حتَّى يَرضَى عنها** "قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان

ہے، جب کوئی شخص اپنی بیوی کو صحبت کے لیے بلائے اور وہ نہ آئے، انکار کر دے تو اللہ عزوجل اس پر غصہ رہتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو جائے"۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ثلاثةٌ لا يقبَلُ اللهُ لهم صلاةً ولا يرفَعُ لهم إلى السَّماءِ حسنةً: العبدُ الآبِقُ حتَّى يرجِعَ إلى مواليه فيضَعَ يدَه في أيديهم والمرأةُ السَّاخطُ عليها زوجُها حتَّى يرضى والسَّكرانُ حتَّى يصحوَ** "تین لوگ ایسے ہیں جن کی نہ نماز قبول ہوتی ہے اور نہ آسمانوں پر ان کی کوئی نیکی پہنچتی ہے: بھگوڑا غلام یہاں تک کہ وہ اپنے آقا کی طرف لوٹ آئے اور وہ اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دے، وہ عورت جس سے اس کا شوہر ناراض ہو، اور نشہ میں چور آدمی یہاں تک کہ ہوش میں آجائے" (طبرانی)۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں: **المرأةُ لا تُؤدِّي حقَّ اللهِ عليها حتى تُؤدِّيَ حقَّ زوجِها كلَّهُ حتى لو سألَهَا وهي على ظهرِ قَتَبٍ لم تمنعْهُ نفسَهَا** "عورت اپنے رب کا حق تب تک ادا نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنے شوہر کے مکمل حقوق ادا نہ کر دے، اگر شوہر اسے (جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے) ایسی حالت میں بلائے کہ عورت اپنی سواری پر ہو، اس حالت میں بھی بیوی کو منع کرنے کی اجازت نہیں"۔

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: **اثنان لا تُجاوِزُ صلاتُهما رؤوسَهما عبدٌ أبَق من مواليه حتَّى يرجِعَ وامرأةٌ عصت زوجَها حتَّى ترجِعَ** "دو لوگ ایسے ہیں کہ جن کی نمازیں ان کے سروں سے تجاوز نہیں کرتیں، بھاگا ہوا غلام جب تک کہ اپنے آقا کے پاس نہ لوٹ آئے، اور شوہر کی نافرمانی کرنے والی بیوی یہاں تک کہ وہ (فرمانبرداری میں) واپس آجائے" (طبرانی، حاکم)۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت منقول ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: **إنَّ المرأةَ إذا خرجت من بيتِها وزوجُها كارِهٌ لعنها كلُّ ملَكٍ في السَّماءِ وكلُّ شيءٍ مرَّت عليه غيرَ الجنِّ والإنسِ حتَّى ترجعَ** "جب عورت اپنے شوہر کی

مرضی کے برخلاف گھر سے نکلتی ہے تو آسمان کا ہر فرشتہ اس پر لعنت کرتا ہے اور ہر وہ چیز لعنت کرتی ہے جس کے پاس سے وہ گزرتی ہے سوائے جنوں اور انسانوں کے، یہاں تک کہ وہ عورت گھر لوٹ آئے"۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا: **أَيُّ النِّسَاءِ خَيْرٌ** "کون سی عورت بہترین ہے؟"، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **التي تَسُرُّهُ إذا نَظَرَ ، و تُطِيعُهُ إذا أمَرَ ، لا تُخالِفُهُ في نَفسِها و لا مالِها بِما يَكرَهُ** "جسے دیکھ کر اس کا شوہر خوش ہو جائے اور جو وہ حکم دے، وہ اسے پورا کرے اور اپنی جان و مال کے معاملے میں شوہر کی طبیعت کے خلاف ناپسندیدہ کام نہ کرے"۔ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: **إذا صلت المرأةُ خمسَها وصامتْ شهرَها وحفظتْ فرجَها وأطاعتْ زوجَها قيل لها: ادخلي الجنَّةَ من أيِّ أبوابِ الجنَّةِ شئتِ** "جب عورت پانچ وقت کی نماز کی پابندی کرے، رمضان کے روزے پابندی سے رکھے، شرمگاہ کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کی فرماں برداری کرے تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جا"۔ اس حدیث میں نماز اور روزے کی پابندی، زنا سے بچنے اور شوہر کی اطاعت کو عورت کے لیے جنت میں داخلے اور اس کے لیے جنت کے تمام دروازے کھلنے کی شرط کے طور پر بیان کیا گیا ہے، پس ان میں سے اگر کوئی ایک فرض بھی چھوٹ گیا تو جنت کے دروازے کھلنے میں رکاوٹ اور حساب میں سختی کا اندیشہ ہے۔

تو جس طرح نماز و روزہ مخصوص اوقات میں ہمیشہ کے لیے فرض عبادتیں ہیں جب تک انسان کی رگ پھڑکتی اور آنکھ جھپکتی ہے، اسی طرح زنا سے بچنا اور شوہر کی اطاعت کرنا عورت پر اس وقت تک فرض ہے جب تک اس کی رگیں رواں اور آنکھیں جھپکتی رہیں اور وہ ان دونوں عبادتوں کو ادا کرنے پر قادر بھی ہو۔ شوہر کی فرمانبرداری صرف اسی صورت میں عورت پر لازم نہیں جب دونوں (شوہر اور بیوی) میں انتہائی محبت کا تعلق قائم ہو، بلکہ شوہر جب تک اس کا شوہر ہے خواہ آپس کی گھریلو زندگی میں دونوں خوش و خرم ہوں یا ناراض ہوں، عورت پر اس کی اطاعت لازم ہے۔

شوہر کی اطاعت کو اللہ عزوجل نے بیوی پر نماز وروزہ کی طرح اس وقت تک واجب کیا ہے جب تک ازدواجی رشتہ قائم رہے، پس یہ فرض (شوہر کی اطاعت) کسی شرط پر موقوف نہیں ہے اور عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنی طرف سے اطاعت کرنے اور نہ کرنے کی حالتیں از خود متعین کرتی پھرے۔ لہٰذا جس طرح زندہ ہونے کی وجہ سے اس پر ہمیشہ کے لیے نماز قائم کرنا اور زنا سے بچنا فرض ہے، اسی طرح جب تک ازدواجی رشتہ قائم ہے شوہر کی اطاعت بھی اس پر فرض ہے۔ عورت کو یہ جان لینا چاہیے کہ اگر شوہر کی اطاعت ایک محکم فریضہ نہ ہوتا کہ جس کے اہتمام سے اس کا جنت میں جانا اور اس کے عدم اہتمام یعنی شوہر کی کھلی نافرمانی، زبان درازی اور بدتمیزی کی بنا پر اس کا جہنم میں جانا مقدر ہے تو رسول اللہ ﷺ شوہر کی اطاعت کے ثواب کو جہاد وشہادت کے برابر قرار نہ دیتے، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی روایت کے آخر میں مذکور ہے: **أَبلِغي من لَقِيتِ من النِّساءِ ؛ أنَّ طاعةَ الزوجِ واعترافًا بحقِّه يعدِلُ ذلك** "جن عورتوں سے تم ملو انھیں یہ بتادو کہ شوہر کی اطاعت کرنا اور اس کے حقوق پورے کرنا اس (یعنی اللہ کی راہ میں جہاد اور شہادت) کے برابر ہے"۔ اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی روایت جس میں نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ: **المرأةُ لا تُؤدِّي حقَّ اللهِ عليها حتى تُؤدِّيَ حقَّ زوجِها كلَّهُ** "عورت کبھی اللہ تعالی کا حق ادا نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ اپنے شوہر کا پورا حق ادا نہ کرے"۔ اس حدیث کے پیش نظر شوہر کی اطاعت کے اجر عظیم اور اسلام میں اس کا مقام اور اس کی نافرمانی کرنے کا کبیرہ گناہ ہونا واضح ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد مبارک ہے: **﴿إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا﴾** "اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تمہارے بقیہ گناہ معاف کر دیں گے اور تمہیں اکرام کی جگہ (جنت) میں داخل کریں گے" (النساء: 31)۔ اس آیت سے متعلق قرطبیؒ کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول نقل ہے کہ: الكبيرة كل ذنب ختمه الله بنار أو غضب أو لعنة أو عذاب "گناہ کبیرہ ہر وہ گناہ ہے جس کے ارتکاب پر اللہ تعالی نے جہنم، اپنا غضب، لعنت یا عذاب کی وعید سنائی ہے"۔ چنانچہ اگر احادیث کا جائزہ لیا جائے تو بہت سی احادیث ایسی ملتی ہیں

جن میں رسول اللہ ﷺ نے نافرمان بیوی کو اللہ کے غضب، اللہ کے عذاب اور فرشتوں کی لعنت سے ڈرایا ہے۔ اور کیا یہ کم ہے کہ شوہر کی نافرمانی کرنے کا، نماز جان بوجھ کر چھوڑنے، رمضان کے روزے نہ رکھنے اور زنا کے ارتکاب سے موازنہ کیا گیا ہے؟ یہ دلائل شوہر کی نافرمانی کے عمل کو اللہ کے دین میں کبیرہ گناہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ: أَيُّ النِّسَاءِ خَيْرٌ "کون سی عورت بہتر ہے؟"، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **التي تَسُرُّهُ إذا نَظَرَ، و تُطِيعُهُ إذا أمَرَ، لا تُخالِفُهُ في نَفسِها و لا مالِها بِما يَكرَهُ** "وہ عورت جسے اس کا شوہر دیکھے تو خوش ہو جائے اور جب وہ اسے حکم کرے تو اس کی اطاعت کرے اور اپنے نفس ومال میں اس کی طبیعت کے خلاف کام نہ کرے"۔ یہ روایت سنن (نسائی، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ) میں صحیح اسناد کے ساتھ مروی ہے۔

(شوہر کو) خوش رکھنا بیوی پر فرض ہے

اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد ہے: **﴿وَمِنْ ءَايَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً إِنَّ فِي ذَلِكَ لآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾ "اور اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم میں سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس جاکر سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت کے جذبات رکھ دیے، یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں"** (الروم: 21)۔

اس آیت کریمہ میں نکاح کے مقصد کو متعین کیا گیا ہے اور ازدواجی زندگی کی بہترین وضاحت کی گئی ہے، کیونکہ ایسا نکاح جس میں سکون، اطمینان، رشک بلکہ اس سے بھی بڑھ کر خوشیاں نہ پائی جائیں اس پر یہ آیت ہر گز صادق نہیں آتی، اور نہ ہی وہ کوئی ایسے نکاح کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اللہ جل شانہ اپنے بندوں پر انعام واکرام کرے۔

اس میں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ مرد کی پسلی سے عورت کی تخلیق ایک معجزہ ہے اور عورت کے بیوی ہونے کے ناطے مرد کا اس سے مانوس ہونا، جس سے وہ سکون حاصل کرے، اس کی تخلیق کی طرح ہی ایک معجزہ ہے۔ چنانچہ سکون واطمینان، خوشی، شفقت اور خدا تعالی کے فیصلوں کے سامنے ہتھیار ڈال دینا یہ سب کچھ اللہ عزوجل کی طرف سے ایک تحفہ ہے اور عورت کے روپ میں اللہ تعالی کی طرف سے مرد کے لیے کسی بھی بیش بہا نعمت سے کم نہیں، جسے اللہ تعالی نے مرد کے لیے نکاح کے ذریعے حلال کیا ہے۔ اللہ تعالی اپنے معجزوں کی یاد دلاتا ہے جو بے شمار اور ان گنت ہیں، پھر ان میں سے خاص طور پر اس ایک کو ذکر کر کے انتہائی نرمی اور شفقت کے ساتھ اس میں موجود نشانی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

اسی طرح مذکورہ بالا آیت مردوں اور عورتوں پر یہ بھی واضح کرتی ہے کہ مسلمانوں کے مابین ازدواجی زندگی کے لیے سکون واطمینان بنیادی شرط ہے یہی وجہ ہے کہ کسی بھی مسلمان کو ازدواجی زندگی میں اطمینان نہ ہونے کے باعث کبھی خوشحالی نہیں مل سکتی۔ اور جب کہ ایمان خوشحالی کا تقاضا کرتا ہے اور بدحالی سے بچاتا ہے تو اسی وجہ سے ازدواجی زندگی میں اطمینان کی فراہمی کیلئے کوشش کرنا مرد وعورت دونوں پر واجب ہے۔ افسوس وہلاکت ہے اس پر جو اس مقصد کے حصول کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسی طرح آیت میں واضح طور پر یہ بھی باور کروایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی باہم ازدواجی زندگی کی نوعیت ایک تسلی بخش اور راحت بخش فطرت ہے جس میں ظاہری اور روحانی ہم آہنگی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ آیت خاندانی تعلقات کیلئے اللہ سبحانہ وتعالی کے بنائے گئے نظام، یعنی مرد وعورت کے درمیان شادی کو قائم کرنے کی ضرورت کا تقاضا کرتی ہے۔ ان تعلقات کا تسلسل اور انتظام اسی نظام کے ذریعے حاصل ہوتا ہے جو اس شادی کی فطرت سے متعلق اللہ سبحانہ وتعالی کی دی گئی وضاحت پر پورا اترتا ہے۔ جس طرح کہ اللہ تعالی نے پہاڑوں کو زمیں میں میخوں کے طور پر گاڑا ہے اسی طرح اسلامی معاشرے کے لیے ایسے قوانین وضع کیے ہیں جن سے میاں بیوی کو تجاوز کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

لہٰذا اسلام میں خاندان مرد کی مطلق دیکھ بھال کرنے پر مبنی ہے اور یہ مرد پر فرض وواجب ہے، نہ کہ یہ اس کا حق ہے جس سے وہ دستبردار ہو سکتا ہو، اور دوسری طرف عورت پر مرد کی اطاعت ساری زندگی کیلئے اسی طرح فرض ہے جیسے اس پر ہر حال میں نماز، سچائی اور امانت کی حفاظت لازم ہے۔ بیوی پر شوہر کی فرمانبرداری **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کی شہادت کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔ پس جب بیوی شوہر کی فرماں برداری نہ کرے تو خوشحالی، اطمینان اور برکت نہیں رہتی۔ اسی کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: **ولا تَجِدُ امرأةٌ حَلاوَةَ الإيمانِ ؛ حتى تُؤَدِّيَ حقَّ زَوْجِها** "عورت ایمان کی حلاوت نہیں پا سکتی جب تک کہ اپنے شوہر کا حق ادا نہ کرے"۔ پس شوہر کی اطاعت کرنا معاشرے میں خوشحالی کی بنیادی وجہ ہے اور معجزات کے عنوان میں یہ بات واضح ہے جس کی طرف اس آیت نے توجہ دلائی ہے: ﴿**وَمِنْ ءَايَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا**﴾ "**اور اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم میں سے بیویاں پیدا کیں، تاکہ تم ان کے پاس جاکر سکون حاصل کرو**" (الروم: 21)۔ اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ خوشحالی اس بیوی سے ہوتی ہے جس کے ساتھ مرد کی طبیعت موافقت رکھتی ہے اور اس کے پاس ہونے سے اس کی روح مطمئن ہوتی ہے اور اس کا ساتھ نبھانے سے اسے دلی خوشی ملتی ہے۔

چونکہ ازدواجی زندگی میں خوشی کی بنیاد ہی عورت ہوتی ہے اسی لیے اللہ سبحانہ وتعالی نے ایسے احکامات دیے ہیں جن کی رؤ سے عورت اس زندگی میں اپنا مؤثر کردار ادا کرے، خواہ اپنی رضا ورغبت سے یا مجبوری سے، اور اپنے شوہر کو ہر ممکن خوشی فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہے۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے میاں بیوی کے درمیان خاندانی نظام وتعلقات کے متعلق اوامر ونواہی کو بیان کیا، پھر دیکھ بھال اور نگہداشت کو مرد پر لازم کیا اور عورت پر اللہ کی نافرمانی کے علاوہ ہر معاملے میں شوہر کی فرماں برداری فرض کی، یہاں تک کہ عورت کو شوہر کی اطاعت قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ یا تردد نہ رہے۔ اور پھر اللہ عزوجل نے شوہر کی فرماں برداری کو اپنی عبادت قرار دیا، اور اس عورت کی نماز، روزہ، دعاء اور تسبیح پر قبولیت کے دروازے بند کر دیئے جو اپنے شوہر کی اطاعت نہ کرے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: **فإنِّي لو أمرتُ شيئًا أن يسجُدَ لشيءٍ لأمرتُ المرأةَ أن تسجُدَ لزوجِها والَّذي نفسي بيدِه لا تؤدِّي المرأةُ حقَّ ربِّها حتَّى تؤدِّيَ حقَّ زوجِها** "اگر میں کسی کو کسی کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کے سامنے سجدہ کرے، اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، کوئی عورت اپنے رب کا حق ادا نہیں کر سکتی جب تک کہ اپنے شوہر کا حق ادا نہ کرے"۔

اس حدیث میں نبی ﷺ کی زبان مبارک سے اللہ عزوجل کا یہ پیغام واضح ہو گیا کہ اللہ تعالی اس عورت کی عبادت وبندگی قبول نہیں کرتے جو اپنے شوہر کے حق اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرے، گویا کہ یہ کہا گیا ہے کہ جنت کی راہیں اس عورت کے لیے بند کر دی گئی ہیں جو اپنے شوہر کی نافرمانی کرتی ہے یا جب تک اپنے شوہر کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتی ہے اور اسے پورا نہیں کرتی، جب تک اس سے اس کا شوہر مطمئن نہ ہو جائے۔

تو اللہ عزوجل کا عورت کی کوئی بھی عبادت، صدقہ یا دعا قبول کرنا شوہر کے حقوق ادا کرنے پر موقوف ہے، بصورت دیگر آسمان کا راستہ اس کے لیے بند ہے اور عورت کی کوئی عبادت وبندگی قبول نہیں، یعنی وہ نماز پڑھتے ہوئے بھی ایسی ہو گی گویا کہ اس نے نماز نہیں پڑھی اور روزہ رکھتے ہوئے بھی ایسی ہے گویا کہ اس نے روزہ رکھا ہی نہیں۔ اس کا صدقہ بھی شمار نہیں ہو گا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں: **ثلاثةٌ لا يقبَلُ اللهُ لهم صلاةً ولا يرفَعُ لهم إلى السَّماءِ حسنةً: العبدُ الآبِقُ حتَّى يرجِعَ إلى مواليه فيضَعَ يدَه في أيديهم والمرأةُ السَّاخطُ عليها زوجُها حتَّى يرضى والسَّكرانُ حتَّى يصحوَ** "تین انسانوں کی نہ دعا قبول ہوتی ہے نہ ان کی کوئی نیکی آسمانوں پر چڑھتی ہے: بھاگا ہوا غلام یہاں تک کہ اپنے آقا کے پاس لوٹ آئے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دے، وہ عورت جس سے اس کا شوہر ناراض ہو یہاں تک کہ وہ راضی ہو جائے، اور نشے میں مدہوش آدمی یہاں تک کہ ہوش میں آجائے" (طبرانی)۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: **اثنان لا تُجاوِزُ صلاتُهما رؤوسَهما عبدٌ أبَق من مواليه حتَّى يرجِعَ وامرأةٌ عصت زوجَها حتَّى ترجِعَ** "دوانسانوں کی نماز ان کے سروں سے آگے ہی نہیں بڑھتی: بھاگا ہوا غلام یہاں تک کہ لوٹ آئے، اور شوہر کی نافرمان بیوی یہاں تک کہ نافرمانی کرنا چھوڑ دے" (طبرانی وحاکم نے جید اسناد سے روایت کیا)۔

معاشرے کی خوشحالی کے لیے پہلی شرط خود عورت کی ذات ہے اور ذہنی وفکری طور پر بہترین کردار ادا کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے اللہ تعالی نے اس کے سامنے ایک مشکل انتخاب رکھا، اور وہ انتخاب یہ ہے کہ آیا عورت خدا کی غلامی کو قبول کرتی ہے یا مسترد کرتی ہے۔ اور اسی طرح اپنی زندگی کے ہر ہر کام میں خاص کر اہم ترین امور میں وہ اللہ کی بندگی پر رضامند ہو کر اچھے اعمال پر گامزن ہونا چاہتی ہے یا گمراہیوں کی گھاٹی میں جا پڑنا چاہتی ہے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿**الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلا**﴾ **"وہ اللہ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل والا ہے"** (الملک: 2)۔ اور پھر اللہ نے عورت کے حق میں شوہر کی فرمانبرداری کو اپنی بندگی والی زندگی کے ساتھ منسلک کر دیا، کہ وہ اسے خوش رکھنے میں کوئی کثر نہیں چھوڑے گی اور اگر اس نے شوہر کے حق میں کوئی نافرمانی کا ارتکاب کیا تو وہ دینِ اسلام میں انتہائی خطرناک معاملہ شمار ہوگا۔

اگر عورت کی اس دنیاوی زندگی کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو ہمیں سوائے زنا کے، عورت کے حق میں شوہر کی نافرمانی سے بڑھ کر اور کوئی جرم نظر نہیں آتا، کیونکہ اس فعل کے سبب عورت پر جہنم واجب ہو جاتی ہے، جیسا کہ آیات واحادیث میں واضح ہے جو دیگر مقامات پر مذکور ہے، مگر فرق یہ ہے کہ زنا کے ارتکاب پر حد جاری ہونے کے سبب اگر موت واقع ہو گئی تو وہ موت اس گناہ کو مٹانے کا سبب بن جاتی ہے، اور اللہ کی رحمت سے اسے آخرت میں عذاب نہیں ہو گا، لیکن شوہر کی نافرمانی ایسا گناہ ہے کہ موت سے پہلے توبہ کے بغیر مٹ ہی نہیں سکتا، اور دنیا میں توبہ کا مطلب یہ ہے کہ عورت شوہر کی فرمانبرداری میں پھر سے داخل ہو جائے اور اپنی نافرمانی کے گناہ سے سچے دل سے توبہ کرے۔ پھر جب

عورت شوہر کے حق کو دل و جان سے تسلیم کرلے، اور اس کی نافرمانی سے باز آجائے تو کوئی مشکل ہی باقی نہیں رہے گی اور گھرانے میں سکون و خوشحالی کی بنیادی شرط پوری ہو جائے گی، یعنی یہ کہ بیوی اپنے شوہر کی مکمل فرمانبردار ہو تاکہ اس سے اس کا شوہر بھی راضی ہو اور اس کا رب بھی۔

اللہ سبحانہ وتعالی کے احکامات قبول کرنے کا مطلب جنت میں مقام پانا اور خدا کی نافرمانی کا مطلب جہنم میں ٹھکانہ ہے۔ اس طرح مرد اور عورت دونوں کو یہ اختیار ہے کہ ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرلیں اور اپنا راستہ خود سے طے کریں، یہی وہ ابتدائی اور مشکل مرحلہ ہے، لیکن اگر انسان اس میں بھی غور و تدبر کرے تو یہ مرحلہ اتنا مشکل نہیں بلکہ بہت آسان ہے، کیونکہ اللہ جل شانہ نے جس طرح انسان میں خوف کا مادہ رکھا ہے اسی طرح لالچ کا مادہ بھی انسان میں ودیعت فرمادیا ہے۔ چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالی نے اس معاملے کو حکم شرعی کے طور پر بیان فرمایا ہے تاکہ اپنے حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کو اس عذاب اور جہنم سے ڈرائے جو دلوں کو دہلا کر رکھ دے گا، تو جس طرح نافرمان بیوی کو اپنے عذاب کی وعید سنائی، اسی طرح فرمانبردار اور شوہر کی تسکین کا خیال رکھنے والی بیوی کو اپنی عطا و بخشش کی بھرپور امید بھی دلائی کہ وہ اس عمل کے بدلے جنت کی حقدار ہو گی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **أَلَا أُخبِرُكم بنسائِكُم في الجنَّةِ؟** "کیا میں تمھیں تمہاری جنت میں بیویوں کے بارے میں بتاؤں؟"، ہم نے عرض کیا کہ ضرور کیوں نہیں! تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **كُلُّ وَدُودٍ وَلُودٍ ، إِذَا غَضِبَت أَو أُسِيءَ إِلَيهَا أَو غَضِبَ زَوجُهَا ، قَالَت : هَذِه يَدِي فِي يَدِكَ ، لَا أَكتَحِلُ بِغُمضٍ حَتَّى تَرضَى** "ہر محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی عورت، جب شوہر اس پر غصہ کرے یا اس کے ساتھ برے طریقے سے پیش آئے تو (شوہر کو راضی کرنے کے لیے) کہے کہ میرا یہ ہاتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے، جب تک آپ راضی نہ ہوں گے میں نیند کا مزہ نہیں چکھ پاؤں گی" (طبرانی)۔ اللہ کا معجزہ ہر چیز میں ظاہر ہوتا ہے اور مذکورہ صورت میں اللہ نے عورت پر رحم و کرم فرمایا اور اس پر جنت کا راستہ نہایت آسان فرمادیا، یہ بھی اللہ جل شانہٗ کی نشانیوں میں سے ایک واضح نشانی ہے۔

اس سے بڑھ کر نبی کریم ﷺ نے مردوں سے ارشاد فرمایا: **أكملُ المؤمنينَ إيمانًا أحسَنُهم خُلقًا وخيارُكم خيارُكم لنسائِهم** "بہترین مؤمن وہ ہے جس کا اخلاق بہترین ہے، اور تم میں بہترین وہ ہے جو عورتوں کے معاملے میں بہتر ہے" (ترمذی نے اس حدیث کو روایت کیا اور اسے حسن صحیح گردانا)۔

لہٰذا مبارک ہے وہ عورت جو اپنے شوہر کی اطاعت کرے اور اسے راضی رکھے کہ دنیا میں اس کے لیے بھلائی اور روز قیامت جنت کا سبب ہے، اور اسی کے سبب دنیا و آخرت میں اس کے لیے خوش بختی ہے۔ اور موت کے وقت اللہ کی طرف سے اس پر رحمت کا وعدہ ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ: **أَيُّ النِّسَاءِ خَيْرٌ** "کون سی عورت بہترین ہے؟"، تو نبی ﷺ نے جواب ارشاد فرمایا: **التي تَسُرُّهُ إذا نَظَرَ ، و تُطِيعُهُ إذا أمَرَ ، لا تُخالِفُهُ في نَفسِها و لا مالِها بِما يَكرَهُ** "وہ عورت جس کا شوہر اسے دیکھے تو خوش ہو جائے اور جب وہ اسے حکم دے تو وہ اس کا حکم مانے اور اپنے نفس و مال میں اس کا ناپسندیدہ کام نہ کرے"۔ یہ روایت سنن (نسائی، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ) میں صحیح اسناد کے ساتھ مروی ہے۔ لہذا عورت کو حدیث میں "خیر" یعنی بہترین کہنا اور ایک دوسری حدیث میں خیر ما یکنز المرء یعنی "مرد کا بہترین خزانہ" کہنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ عورت پر جنت میں داخلے کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ دنیا میں اپنے شوہر کے لیے بھلائی و خوبی کا باعث بنے۔ پس خوش بختی تو خیر کا ہی حصہ ہے، اگر خیر کو انتہائی محدود معانی میں بھی استعمال کریں تب بھی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسی کوئی بھی انفرادی نعمت جو اللہ کی طرف سے بندے کو دی گئی ہو۔ چنانچہ اس معنی میں بھی اچھی بیوی خیر ہی خیر ہے۔ لہٰذا مذکورہ حدیث عورت پر "خیر" کے معنی میں تبھی سچ ہوگی کہ جب وہ اپنے شوہر کے لیے تمام تر خوش بختی و سعادت کا منبع ہو وگرنہ شوہر اسے دیکھ کر کیوں کر خوش ہوگا؟

عورت کی ذمہ داری آسان ہو یا مشکل مگر ازدواجی زندگی میں درپیش مشکلات پر صبر کرنے کا اجر جنت ہے، اور صبر کرنے پر اجر تب ہی ملتا ہے جب انسان اخلاق حسنہ کے ساتھ اور دل کی رضا کے ساتھ صبر کرنے کا حق ادا کرے۔ پس برے اخلاق اور ناگواری وغصے والا سلوک وطرز عمل صبر کا اجر ضائع کر دیتا ہے کیوں کہ یہ سب صبر کے منافی ہے۔

فہرست

ریاست اور معاشرے کی تقسیم

انجینئر معیز-پاکستان

پاکستان کی حالیہ سیاست میں متعدد واقعات نے ریاست کی کمزوری اور اپنی رِٹ کو نافذ کروانے کیلئے اس کی اہلیت کے متعلق ایک بحث کو جنم دیا ہے۔ ایسے ہی کچھ واقعات میں سے ایک، پاکستانی ریاست کا تحریک طالبان پاکستان کے ساتھ مذاکرات کرنا ہے، جو پشتون جنگجوؤں کا ایک گروہ ہے جنہوں نے پاکستانی ریاست سے ایک دہائی سے زیادہ عرصے تک جنگ لڑی ہے۔ ایسا ہی ایک اور قدم، پاکستانی ریاست کی طرف سے تحریک لبیک پاکستان کو کالعدم قرار دینے کا فیصلہ تھا جسے بعد میں تبدیل کر دیا گیا اور اس گروہ کے ساتھ معاہدہ کر کے اسے ایک عام سیاسی جماعت کے طور پر کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ ان دونوں اقدامات پر، لبرل اشرافیہ نے طاقتور اور منظم گروہوں کے مقابلے میں ریاست کے کمزور ہونے پر تنقید کی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ریاست میں سیاسی قابلیت ہی نہ تھی کہ وہ دباؤ کا سامنا کر سکے اور وہ ان منظم تحریکوں کے جانب سے پیدا کردہ سیاسی دباؤ کے آگے ڈھیر ہو گئی۔

ریاست کی کمزوریوں پر تنقید یہاں پر ہی ختم نہیں ہوتی۔ لبرل دانشوروں نے ریاستی اہلکاروں، سیاسی لیڈروں اور حکمرانوں کو بھی ریاست کی طاقت کا استعمال نہ کرنے پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے کہ ریاست ان گروہوں کے اس مؤقف کو چیلنج کرتی، جس کو وہ طاقتور مؤقف سمجھتے ہیں اور جس نے اُن سیکولر بنیادوں اور سیکولر افکار کو چیلنج کر دیا ہے جن پر موجودہ پاکستانی ریاست قائم ہے۔ یہ تنقید اُن احساسات کی بنیاد پر ہے کہ معاشرے اس سوچ پر اکٹھا ہو رہا ہے کہ اسلام کا سیاست اور ریاستی معاملات میں مرکزی کردار ہونا چاہئے۔ ریاست میں اسلام کے سیاسی کردار کے لئے ایسی زبردست اور پھیلتی ہوئی حمایت کو ریاست کی طرف سے معاملات کی انجام دہی کے لئے ایک "خطرے" کے طور پر دیکھا جا رہا ہے اور اسے ایک مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ معاشرہ بنیاد پرست ہوتا جا رہا ہے اور ریاست کو ہر صورت معاشرے کو بنیاد پرستی

سے بچانا ہے۔ مشرف کی "روشن خیال اعتدال پسندی"، مدرسہ اور تعلیمی نصاب کی تجدید، بنیاد پرست اسلامی جماعتوں کو تتر بتر کرنا اگرچہ وہ پر تشدد نہ بھی ہوں، نیشنل ایکشن پلان، یہ تمام اقدامات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ریاست معاشرے کو مسائل میں الجھا دیکھتی ہے اور ریاستی عہدیدار معاشرے کو اپنے تصور میں ڈھالنا چاہتے ہیں۔

تاہم، ریاست کا یہ نقطۂ نظر بذاتِ خود ایک گہرا مسئلہ ہے۔ لبرل دانشور حضرات ریاست کو چند مخصوص ناقابلِ سمجھوتہ خصوصیات کے ساتھ ایک غیر لچکدار ادارے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ذرا اس بغاوت پر غور کریں جو پاک افغان سرحد کے ساتھ موجود پاکستانی پشتون علاقوں میں پھوٹی۔ لبرل اور سرکاری حکام اس فتنہ و فساد کو ایک رجعت پسندانہ تحریک کے طور پر پیش کرتے ہیں جس نے تشدد پر ریاستی اجارہ داری کے اصولوں کو چیلنج کر دیا اور پُر تشدد غیر ریاستی گروہوں کو اُبھارا۔ یہ حقیقت کی ایک غلط تصویر کشی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ پشتون بغاوت، جو پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقوں میں پھوٹ پڑی تھی، ایک مزاحمتی تحریک تھی جو پاکستانی ریاست کی اُس خارجہ پالیسی کے خلاف تھی جو علاقے سے متعلق امریکی پالیسی کے زیرِ اثر تھی۔ پشتون قبائل نے پاکستانی ریاست کی جانب سے امریکہ کی غلامی کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور ریاست کے خلاف اس وقت مزاحمت شروع کر دی جب ریاست نے انہیں مجبور کرنا چاہا کہ وہ علاقہ میں امریکی ایجنڈے کے آگے سرنگوں کر دیں۔ پھر خطے کیلئے فوجی آپریشن سے تبدیل ہو کر سیاسی مذاکرات کی امریکی پالیسی کے نتیجے میں بغاوت میں کمی واقع ہونا اور بالآخر قبائلی علاقوں کا امریکہ کے اس خطے سے نکل جانے کے بعد پر سکون ہو جانا، یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہاں لبرل اشرافیہ اور پاکستانی حکام کی ریاست کے بارے میں نقطہ نظر کی غلطی واضح ہو جاتی ہے۔ ریاستی اتھارٹی یا رِٹ کوئی ایسا مطلق اصول نہیں ہے جسے بزورِ طاقت نافذ کیا جا سکتا ہے بلکہ ریاستی اتھارٹی اور رِٹ دراصل سیاسی اتفاق رائے کی نمائندہ ہوتی ہے۔ ریاست کی رٹ اپنی اصل اور جوہر کے لحاظ سے ایک سیاسی معاملہ ہوتا ہے۔ ریاست کی رِٹ سیاسی اتفاق رائے کے نتیجے میں لاگو جاتی ہے۔ اگر ریاست ایک ایسے سیاسی اتفاق رائے کو نافذ کرتی ہے جسے عوام کی اکثریت نے مسترد کر دیا ہو، تو ریاست کی اتھارٹی اور قانونی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ ایسی صورت میں طاقت کے استعمال سے ریاست کی رٹ کو نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

تحریک لبیک پاکستان کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ ٹی ایل پی TLP نے ریاست کی اس خارجہ پالیسی کو مسترد کر دیا جو حرمتِ رسول ﷺ اور ناموسِ رسالت پر معاشی مفادات کو فوقیت دیتی تھی۔ اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ناموس کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائے۔ اسلام کسی آزادئ رائے کو قبول نہیں کرتا اور نہ ہی کسی کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ ہمارے پیارے پیغمبر محمد ﷺ کی حرمت کی پامالی کرے بلکہ ایسے افراد اور ریاست، جو اسلام کے مقدسات پر حملہ کی جرأت کریں، مسلمان حکمرانوں کو ان کا سخت احتساب کرنا چاہیے۔ گستاخانہ فرانسیسی ریاست کے سامنے کھڑے ہونے سے انکار اور فرانسیسی سفیر کو بے دخل کرنے سے پاکستانی ریاست کے انکار نے ریاست کے لئے ایک قانونی جواز کا بحران کھڑا کر دیا۔ ریاست، معاشرے میں پائے جانے والے سیاسی اتفاقِ رائے کا نفاذ نہیں کر رہی تھی۔ ایسی صورتحال میں، ریاست نہ تو اپنی اتھارٹی کو نافذ کر سکتی ہے اور نہ ہی اپنا راستہ بنا سکتی ہے۔

یہاں پر ریاست کے تصورات سے متعلق چند گہرے سوالات پوچھنا ضروری ہیں۔ کیا ریاست ایسے نظریات اور اقدار کی حامل ہو سکتی ہے، جن سے وہ حکومت تو کرنا چاہتی ہے، لیکن وہ نظریات معاشرے سے بالکل الگ ہوں؟ کیا ریاست، معاشرے سے ہٹ کر ایک علیحٰدہ ادارہ ہوتا ہے یا یہ محض معاشرے ہی کا ایک مظہر اور معاشرے کی ہی توسیع ہے؟ کیا ریاست کی، معاشرے سے ہٹ کر اپنی بھی کوئی سوچنے کی بنیاد ہوتی ہے یا ریاست صرف وہ نافذ کرتی ہے جو معاشرہ پہلے ہی طے کر چکا ہوتا ہے؟

ریاست اپنی حقیقت میں معاشرے ہی کی انتظامی قوت ہوتی ہے اور اسی کی توسیع (extension) اور مظہر ہوتی ہے۔ معاشرہ اپنے اندر، اُن نظریات اور اقدار کے حوالے سے ایک سیاسی اتفاقِ رائے پیدا کرتا ہے جن کے گرد وہ خود کو ایک سیاسی معاشرے کے طور پر منظم کرتا ہے۔ یہ نظریات اور اقدار پھر حکمرانی کی بنیاد بنتے ہیں اور معاشرہ انہی نظریات اور اقدار سے جُڑے حکمرانی کے ڈھانچے اور ادارے قائم کرتا ہے۔ ریاست کی اپنی کوئی سوچنے کی بنیاد نہیں ہوتی، وہ تو صرف سیاسی اتفاقِ رائے کو ہی نافذ کرنے والی ہوتی ہے۔ ریاست اور معاشرے کو ایک دوسرے سے الگ الگ دیکھنا سنگین غلطی ہو گی، وہ دونوں ایک ہی وجود ہیں۔

ریاست اور معاشرے کی موجودہ تقسیم کی جڑیں، استعمار کی تاریخ میں پیوست ہیں۔ جب یورپی استعمار نے عثمانی خلافت کو تباہ کر دیا تو انہوں نے مسلم علاقوں میں قومی ریاستیں تشکیل دے دیں۔ یہ ریاستیں، مغربی معاشروں کے تصورات اور اقدار پر ہی استوار کی گئیں اور اپنی اصل جوہر میں مسلم علاقوں پر مغربی متبادل ہی تھیں۔ آج بھی وہ انہی یورپی اور مغربی استعمار کی باقیات ہیں۔ چونکہ یہ ریاستیں مغربی معاشروں سے مستعار لیے گئے تصورات پر قائم کی گئی ہیں اور ان کے نزدیک مسلم معاشرے ایک مختلف اقدار اور تصورات رکھتے ہیں، اس لیے انہوں نے چاہا کہ مسلمان معاشروں کو مغربی افکار اور نظریات کے مطابق ڈھال دیں۔ ریاست اور معاشرے کے مابین یہی وہ ٹکراؤ ہے جو مسلم دنیا میں جمود اور تنزلی کا باعث ہے۔ مسلم دنیا دوبارہ نشاۃ ثانیہ حاصل کرلے گی جب یہ ریاست اور معاشرے کی تقسیم ختم ہو جائے گی اور جب ایک خالص و نظریاتی اسلامی ریاستِ خلافت، مسلمان معاشروں سے اُبھرے گی جو مسلمانوں کی اکثریت کے سیاسی نظریات کی آئینہ دار ہو گی اور اللہ سبحانہ وتعالی کی نازل کردہ وحی کی بنیاد پر ہی حکمرانی کرے گی۔ اللہ سبحانہ وتعالی نے ارشاد فرمایا،

﴿ وَأَنِ احكُم بَينَهُم بِما أَنزَلَ اللَّهُ وَلا تَتَّبِع أَهواءَهُم وَاحذَرهُم أَن يَفتِنوكَ عَن بَعضِ ما أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيكَ ﴾

"اور (اے محمد ﷺ) آپ ان کے درمیان اسی سے حکم کریں جو اللہ نے نازل کیا ہے، اور اُن کی خواہشات کی پیروی مت کریں اور ان سے بچتے رہیں کہ جو اللہ نے آپ پر نازل فرمایا ہے اس کے کسی حکم کے متعلق یہ کہیں آپ کو فتنے میں نہ ڈال دیں" (المائدہ 5:49)

فہرست

اسلامی ریاست، کفر بواح اور دار الکفر

عثمان عادل۔ پاکستان

حکمرانی کوئی جدید تصور نہیں بلکہ یہ اس وقت سے ہے جب سے معاشرے کا وجود ہے کہ جس کے امور کی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے، جو ایک اتھارٹی یا حکمرانی کے بغیر ممکن نہیں۔ ایسی اتھارٹی ہر دور میں موجود رہی ہے، خواہ یہ ماضی میں قبیلے کی سرداری ہو یا آج کے جدید دور میں ایک نیشن سٹیٹ کی اتھارٹی۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ لوگ اپنے لیے ایک لیڈر یا سربراہ چاہتے ہیں، اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اس کی اطاعت کرنے کو درست سمجھتے اور اطاعت کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ درحقیقت اطاعت انسانوں میں ایک نہایت اہم خوبی ہے جو کہ انسان میں بچپن سے ہی پیدا ہو جاتی ہے، جب وہ والدین جیسی شخصیات کی اطاعت کرتا ہے جنہوں وہ اپنے ساتھ مخلص اور خیر خواہ تصور کرتا ہے۔ قرآن میں موجود ماضی کی اقوام کے واقعات، جو تاریخ کا سب سے مستند ماخذ ہیں، سے واضح طور پر اقوام میں حکمرانی اور حکمرانوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ پس یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسلام نے ایک ایسی حقیقت کے متعلق حکم نہ بتایا ہو جو کہ اجتماعی زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے، ایسا حکمِ شرعی کہ جو آنے والے ہر دور میں قابلِ نفاذ ہو۔ چنانچہ متعدد آیات اور احادیث وارد ہوئی ہیں کہ جو اقتدار و حکمرانی سے متعلق ہیں۔ نصوص میں اقتدار و حکمرانی کے لیے **سلطان، حکم** اور **مُلک** کے استعمال ہوئے ہیں، یہ سب ہم معنی ہیں، جن کے لغت میں معانی ایسی صلاحیت یا اتھارٹی کے ہیں جو احکامات کو نافذ کرے۔ حکم فیصلے یا قضاء کو کہتے ہیں اور حاکم وہ ہے جو فیصلے کو نافذ کرتا ہے۔ اسی طرح ہمیں نصوص میں امیر، امارۃ، امام اور خلیفہ کے الفاظ بھی ملتے ہیں۔

اسلامی اتھارٹی کے لیے **دَولَة الاِسلامیه** کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ جہاں تک لفظ دَولۃ کا تعلق ہے، تو عربی زبان میں اس کے دو معنی ہیں، ادل بدل ہونا اور غلبہ۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا: **كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ** "ایسا نہ ہو کہ دولت تمہارے امیر لوگوں کے ہاتھوں میں ہی ادل بدل کرتی

رہے "(الحشر:7)۔ اسی طرح ارشاد ہوا: **وتلك الایام نداولها بین الناس** "اور یہ (مشکلات وابتلا کے) ایام ہیں جن کو ہم آدمیوں کے درمیان ادل بدل کرتے رہتے ہیں"۔ یہاں لفظ نُدَاوِلُهَا کا مصدر دَولۃ ہے، یعنی ادل بدل ہونا۔ نصوص میں لفظ دولۃ انہی دو معنوں میں آیا ہے۔ تاہم غلبہ واقتدار کی بھی یہی حقیقت ہے کہ یہ کبھی ایک کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور کبھی دوسرے کے ہاتھ میں، اور اقتدار غلبے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے پس اس کے لیے دولۃ کا لفظ مستعمل ہوا اور یہ ایک عام اصطلاح بن گئی۔

دولة الاسلامیه کا ترجمہ اردو زبان میں اسلامی ریاست کیا جاتا ہے، لفظ ریاست کی جڑ عربی لفظ رأس اور رئیس سے ہے، رئیس سردار یا لیڈر کو کہتے ہیں جیسا کہ عبد اللہ بن ابی ابن سلول کو رئیس المنافقین کہا جاتا ہے، یعنی منافقین کا سرغنہ یا سردار۔ اگرچہ دولة الاسلامیه کی اصطلاح کو لفظ خلافت کے ساتھ بدل کر استعمال کیا جاتا ہے، تاہم نصوص اور فقہ کی کتابوں میں خلافت کے لیے دولۃ الاسلامیہ کی اصطلاح استعمال نہیں کی گئی۔ ماضی میں فقہاء نے اسلامی اتھارٹی اور اس کے دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات کے لیے دارالاسلام اور دارلکفر کی اصطلاحات استعمال کیں۔ اور یہ نہایت معنی خیز اور implications یا عواقب کے لحاظ سے وسیع اصطلاحات ہیں۔ یہ اصطلاحات ایک شرعی حقیقت کو بیان کرتی ہیں، یعنی یہ ایسی حقیقت پر دلالت کرتی ہیں جو شریعت میں مذکور ہے اور یہ حقیقت مجتہدین کی اپنی ایجاد کردہ نہیں ہے۔ دارالاسلام بعینہٖ خلافت ہی ہے، ماسوائے کہ کوئی صوبہ یا علاقہ اسلامی ریاست سے بغاوت کر دے اور وہاں اسلام ہی نافذ ہو رہا ہو، تو وہ دالاسلام ہی کہلائے گا مگر اس کی حقیقت باغی کی ہے کہ جسے خلافت کا حصہ بنانا لازم ہے۔ دارالاسلام کی شرعی حقیقت کے متعلق اللہ سبحانہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے: **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۪-وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَ لَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًاؕ-يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـٴًـاؕ-وَ مَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ "جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور**

خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بد کردار ہیں" (النور: 55)۔ اس آیت میں استخلاف فی الارض کے بعد دو باتیں بیان کی گئی ہیں، (1) دین کا محکم و مستحکم ہونا (2) خوف کی حالت کا امن میں تبدیل ہونا۔ اور دار الاسلام کی یہی شرائط ہیں یعنی اسلام کا نفاذ اور امان کا مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا۔ "دار الاسلام" کی اصطلاح صحابہ کے دور میں معروف تھی، امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں بیان کیا ہے کہ خالد بن ولیدؓ نے حیرہ کے لوگوں کو جو معاہدہ لکھ کر دیا، اس کے الفاظ ہیں: أيُّما شيخ ضعف عن العمل، أو أصابته آفة من الآفات، او كان غنياً فافتقر، وصار أهلُ دينه يتصدَّقون عليه طُرِحَت عنه جزيته، و عِيلَ من بَيتِ مالِ المسلمين، و عيالُه، ما أقام بدار الهجرة و دار الاسلام، فان خرجوا الى غير دار الهجرة و دار الاسلام فليس على المسلمين النفقة على عيالهم "بوڑھا شخص جو کام سے معذور ہو جائے یا اس پر کوئی مرض یا مصیبت آن پڑے یا جو مال دار ہو اور پھر ایسا غریب ہو جائے کہ اس کے ہم مذہب اسے خیرات دینے لگیں تو اس کے سر سے جزیہ ساقط کر دیا جائے، اور جب تک وہ دار الہجرت اور دار الاسلام میں رہے گا اس کے اور اس کے اہل و عیال کے مسارف مسلمانوں کے بیت المال سے پورے کیے جائیں، البتہ اگر ایسے لوگ دار الہجرت اور دار الاسلام کو چھوڑ کر باہر چلے جائیں تو ان کے اہل و عیال کی کفالت مسلمانوں کے ذمہ نہ ہو گی"۔

اصطلاحات سے قطع نظر، عام طور پر کسی بھی ریاست کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ "انها كيان تنفيذي لمجموعة المفاهيم والمقاييس والقناعات التي تقبلتها مجموعة من الناس." **"یہ وہ تنفیذی ڈھانچہ ہے جو اُن تصورات، پیمانوں اور اعتقادات کے مجموعے کو نافذ کرتا ہے جن کو لوگوں کے مجموعے نے قبول کیا ہو"**۔ جب ایک علاقے میں بسنے والے لوگ کچھ مخصوص تصورات، پیمانوں اور اعتقادات کو اختیار کر کے ایک اتھارٹی کو قائم کرتے ہیں جو ان تصورات، پیمانوں اور اعتقادات کے مطابق لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کرتی ہے تو ریاست وجود میں آ جاتی ہے۔ یہ مدینہ کی ریاست جیسی چھوٹی بھی ہو سکتی ہے اور سوویت یونین جیسی دو براعظموں

پر پھیلی ہوئی ریاست بھی، یہ امپیریل ریاست بھی ہو سکتی ہے اور جمہوری ری پبلک بھی، یہ ایک اسلامی ریاست بھی ہو سکتی ہے اور کفریہ ریاست بھی۔

اسلامی ریاست کا انگریزی میں ترجمہ Islamic State(اسلامک سٹیٹ) کے طور پر کیا جاتا ہے، تاہم اسلام کا تصورِ ریاست کئی پہلوؤں سے مغرب کے اس Modern Territorial State کے تصور سے مختلف ہے کہ جس نے اُس فکری و سیاسی پس منظر سے جنم لیا کہ جو مغرب کے ساتھ خاص ہے اور جسے پھر مغرب نے پوری دنیا میں پھیلایا اور پھر امریکہ نے اقوام متحدہ اور کثیر الجہتی (multilateral) اداروں کے ذریعے اس ریاستی تصور کو پختہ تر کر دیا۔ مغرب کے نزدیک سٹیٹ زمین کے ایک مخصوص ٹکڑے پر مستقل طور پر بسنے والے لوگوں اور ان کی حکومت کا نام ہے، کیونکہ مغرب کے نزدیک سٹیٹ کی ایک مخصوص سرحد ہوتی ہے جو کہ وطن یا کنٹری ہے، اور اس میں اقتدار اعلیٰ کے مالک عوام ہوتے ہیں جبکہ حکومت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتی ہے۔ پس ملک، اس کے باشندوں اور حکمرانوں کے مجموعے کو سٹیٹ تصور کیا گیا۔ لیکن اسلام میں ریاست کی کوئی مستقل سرحدیں نہیں ہوتیں کیونکہ اسلام کی دعوت کو دنیا تک پہنچانا لازم ہے اور اسلام کی اتھارٹی کے دوسرے علاقوں تک پھیلنے کے ساتھ سرحدیں بھی پھیلتی جاتی ہیں۔ اور لفظ 'وطن' کے معنی صرف یہ ہیں کہ ایک ایسی جگہ جہاں ایک شخص مستقل طور پر رہائش پزیر ہو، یعنی اس کا گھر اور علاقہ، اس کے علاوہ وطن کے کوئی اور معنی نہیں۔ اقتدارِ اعلیٰ شریعت کو حاصل ہے لوگوں کو نہیں۔ حکمران اور عوام دونوں شریعت کے ارادے میں مقید ہوتے ہیں۔ حکمرانی یا اتھارٹی انفرادی ہوتی ہے اور یہ اجتماعی نہیں ہوتی۔ اسلام میں حکمران کو اتھارٹی سے متعلق تمام اختیارات حاصل ہوتے ہیں لہٰذا خلیفہ ہی ریاست ہوتا ہے۔

سٹیٹ کے تصور کے اس فرق کی بنا پر مسلمانوں کے اہلِ علم حلقوں میں کچھ لوگ یہ سوچ رکھتے ہیں کہ دارالاسلام یا خلافت کے لیے "اسلامک سٹیٹ" کے لفظ کا استعمال سرے سے درست ہی نہیں کیونکہ سٹیٹ تو مغربی سرمایہ دارانہ ورلڈ آرڈر کی یونٹ یا اکائی کا نام ہے۔ تاہم یہ سوچ درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ سٹیٹ بنیادی طور پر

ایک نیوٹرل اصطلاح ہے، یہ یونان کی سٹی سٹیٹ بھی ہو سکتی ہے اور روم کی امپیریل سٹیٹ بھی، یہ فیوڈل سٹیٹ بھی ہو سکتی ہے اور سوشلسٹ سٹیٹ بھی، اسلامک سٹیٹ بھی ہو سکتی ہے اور نیشن سٹیٹ بھی۔ فی واقع اس کی حقیقت لفظ قانون کی طرح ہے، کہ جو ایک اجنبی اصطلاح ہے مگر اس کا استعمال درست ہے کیونکہ اس سے مراد وہ حکم ہے جسے حکمران نافذ و جاری کرتا ہے اور یہ تصور اسلام میں بھی پایا جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال بہر حال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک اسلامی ریاست بھی تو کسی سرزمین پر قائم ہوتی ہے اور اس کے اپنے باشندے ہوتے ہیں، تو کیا اسلامی ریاست بھی مغرب کی Modern Territorial State کی طرح زمین کے ایک ٹکڑے پر بسنے والے لوگوں اور ان کی قائم کردہ حکومت کا نام نہیں ہے۔ تاہم ایسا نہیں ہے۔ ہم جرمنی کی ریاست کے متعلق یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ جرمنی کے سرزمین سے ختم ہو کر ہندوستان کی سرزمین پر قائم ہو جائے اور اسے جرمنی ہی کہا جائے، مگر اسلامی ریاست کے متعلق یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک جگہ پر قائم تھی اور پھر وہاں ختم ہو گئی اور کسی اور جگہ پر کسی اور رنگ اور کسی مختلف نسل کے مسلمانوں نے اسلامی ریاست کو قائم کر دیا۔ جیسا کہ آج کسی بھی سرزمین پر ریاستِ خلافت قائم ہو جائے، جو ماضی میں ریاستِ خلافت کا حصہ نہیں تھی، تو اس خطے کو اسلامی ریاست ہی کہا جائے گا اور یہ ویسے ہی دار الاسلام ہو گا جیسا کہ ماضی کی خلافتیں تھیں، کیونکہ اسلام میں اصل اعتبار اتھارٹی اور اس کی نوعیت کا ہے۔

پاکستان کا لبرل ٹولہ یہ تاثر دیتا ہے کہ ریاست کے متعلق روشن تصورات نے مغرب میں ہی آنکھ کھولی۔ کیونکہ وہ اسی کو جدید ریاست سمجھتا ہے کہ جو مغرب کے Modern Territorial State کے تصور کے مطابق ہو اور جس کا ڈھانچہ حکمرانی کے متعلق مغرب کے سیاسی فلسفے پر مبنی ہو۔ پس اگر ایک ریاست میں لوگوں کے اقتدار اعلیٰ کی نمائندہ پارلیمنٹ موجود نہ ہو اور مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کی خود مختار اداراتی تقسیم نہ ہو تو گویا وہ ماضی کی بادشاہتوں کی طرح ایک دقیانوسی ریاست ہے جو آج کے دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ چنانچہ جب وہ اسلام پر سرسری نظر ڈالتے ہیں اور انہیں یہ اداراتی ڈھانچہ مفقود نظر آتا ہے تو وہ یہ حکم لگاتے ہیں کہ اسلام کا نظام ایک ابتدائی

نوعیت کا نظام ہے جو قبائلی معاشرے کے لیے تو موزوں ہو سکتا ہے مگر جدید دنیا کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جدید جمہوری ریاست میں موجود متوازی خود مختار ادارے اور ان کے اختیارات کی پیچیدہ تقسیم اور اس تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل اور بحران انسان کی عقل کے عاجز و ناقص ہونے کی دلیل ہے جو کہ زندگی کے امور کی دیکھ بھال کے حوالے سے انسان میں پائی جاتی ہے، مگر عقل پرست مغرب کا تکبر اسے اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے روکتا ہے۔ فی الواقع یہ مسئلہ مغرب کے معاشی نظام کے مماثل ہے کہ جو اپنی سمجھ اور نفاذ کے لحاظ سے سخت گنجلک اور پیچیدہ ہے، مگر سرمایہ دارانہ معاشی ماہرین یہ دیکھنے سے قاصر ہیں کہ اس پیچیدگی کی وجہ عقل کا ارتقاء نہیں بلکہ اس بات سے قاصر ہونا ہے کہ انسانی عقل انسانیت کے معاشی امور کو منظم نہیں کر سکتی۔

مغرب ہی سے متاثر پاکستان کا ماڈرنسٹ ٹولہ ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اسلام میں ریاست یا حکمرانی کوئی مستقل حکم نہیں ہے اور نہ ہی یہ اسلام کا مقصود ہے، یہ تو واقعات اس انداز سے وقوع پزیر ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے مدینہ میں حکمرانی کا موقع پیدا ہو گیا، ورنہ کئی انبیاء اور رسولوں نے ریاست قائم نہیں کہ اور اس امر نے وحی کو پہنچانے میں کوئی کمی پیدا نہیں کی، اور رسولوں کا کام وحی پہنچانا ہے حکمرانی کرنا نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سیاسی اسلام موجودہ دور کے اسلامی مفکرین کی اختراع ہے کہ جب مسلمانوں میں سے کچھ اہلِ شعور اٹھے اور انہوں نے کفار کے ظلم و جارحیت کے ردِ عمل میں مسلمانوں کے مسائل کے حل کو اسلام کے بطورِ حکمرانی نفاذ سے جوڑنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ مسلمان معاشروں میں یہ سوچ پھیل گئی کہ اسلامی ریاست کا قیام بھی دین کے احکامات میں سے ایک حکم ہے۔

اسلام میں موجود ریاست کے تصور کے انکار کی پہلی نمایاں کوشش، برطانیہ کے زیر اثر، خلافت کے انہدام کے ایک سال بعد، جامعہ الازہر کے سکالر علی عبد الرازق نے کی تھی جب اس نے 1925 میں ایک کتاب اسلام و اصول الحکم کے نام سے لکھی، جس میں اس نے یہ رائے پیش کی کہ اسلام کوئی مخصوص نظامِ حکومت نہیں دیتا۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ محمد عبدہٗ کا یہ شاگرد بعد میں مصر کی جامعہ الازہر کا ریکٹر بھی بنا!

ماڈرنسٹ سوچ کے حامل افراد نے دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاح کا بھی انکار کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ اصطلاحات فقہانے اس وقت کے حالات کی وضاحت کرنے کے لیے وضع کی تھیں۔ یہ کہتے ہوئے انہوں نے اس سادہ سی حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ فقہاء ایک اصطلاح کسی مفہوم کو بیان کرنے کے لیے وضع کرتے ہیں، اصطلاح کی وجہ سے وہ مفہوم وجود میں نہیں آتا بلکہ وہ نصوص میں پہلے ہی سے مذکور ہوتا ہے۔ جیسا کہ صحیح اور ضعیف حدیث کی اصطلاح۔ اسلام میں اتھارٹی اور حکمرانی کا تصور، اس سے متعلق احکامات، اور اس اتھارٹی کے کفار کے ساتھ تعلقات کے متعلق احکامات شرعی نصوص میں جابجا موجود ہیں اور یہ دارالاسلام اور دارلکفر کی اصطلاح ایجاد کرنے کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ دارالاسلام، دارالشرک، دارالمہاجرین کے الفاظ احادیث میں مذکور ہیں اور یہ اصطلاح کے طور پر صحابہؓ کے دور میں بھی مستعمل تھے، اگرچہ فقہاء نے بعد میں اس پر طویل بحث کی اور تفصیلی احکامات مرتب کیے۔ ماڈرنسٹ سوچ کے حامل افراد کو دارالاسلام اور دارالکفر کی اصطلاح کی نفی کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کیونکہ وہ اس بات کا انکار کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام ایک نظام ہائے حیات ہے، اور ان کے نزدیک ایک ریاست کا صرف مسلمانوں کے عقائد واحکامات کی بنیاد پر استوار ہونا کہ جس میں غیر مسلموں کا کوئی عمل دخل نہ ہو، غلط ہے۔ انکار کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ دائمی جہاد کا انکار کرنا چاہتے ہیں کیونکہ دنیا کے دارالکفر یعنی دارالحرب اور دارالاسلام میں تقسیم سے ہی دارالکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کے لیے اسلامی ریاست کی طرف سے جہاد کرنے کا موضوع کُھلتا ہے۔ ماڈرنسٹ کے نزدیک چونکہ اس وقت مسلمانوں کے آس پاس جتنی غیر مسلم اقوام تھیں وہ بالعموم مسلمانوں سے برسر جنگ تھیں اس لیے فقہاء نے ان سب کے علاقوں کو دارالحرب قرار دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک مستقل اور ابدی جنگ ہے جو اس وقت تک جاری رہے گی جب تک پوری دنیا کو دارالاسلام میں تبدیل نہ کیا جائے۔

تاہم جہاں تک امت کا تعلق ہے تو وہ عرب ہو یا عجم، ماڈرنسٹ کی اسلام سے اجنبی اور مغربی ورلڈ آرڈر سے متاثر سوچ کو پاؤں تلے روندتے ہوئے، حکمرانی کو خالصتاً اسلام کی بنیاد پر استوار کرنے کی جدوجہد میں آگے بڑھ چکی ہے۔ امت اور اس کے علماء میں یہ بحث ہرگز نہیں کہ اسلام میں حکمرانی کوئی تصور ہے بھی یا نہیں ہے، بلکہ بحث یہ ہے

کہ کب ایک اسلامی حکمرانی ایک غیر اسلامی حکمرانی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کب ایک غیر اسلامی حکمرانی یوں تبدیل ہوگئی ہے کہ اب اسے اسلامی حکمرانی کہا جا سکتا ہے اور آج اس تبدیلی کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہئے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی کتاب خلافت و ملوکیت میں اسی بات کو موضوع بحث بنایا کہ کب ایک اسلامی ریاست غیر اسلامی ریاست میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور اپنے تئیں یہ ثابت کیا ہے کہ بنوامیہ کے دور میں خلافت، خلافت نہیں رہی تھی۔ افغانستان میں طالبان کے پہلے اور پھر دوسرے دورِ اقتدار کے نتیجے میں پاکستان میں دوسری بحث کو جِلا بخشی، یعنی کب ایک غیر اسلامی ریاست ایک اسلامی ریاست میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جہاں یہ بحث اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اسلامی ریاست یا خلافت کا قیام مسلمانوں کی اجتماعی نصب العین بن چکا، وہاں یہ مسلمانوں کے اہلِ علم حلقوں میں اس موضوع پر شفافیت کے فقدان کو بھی آشکار کرتی ہے۔

ہم اس نکتے پر مزید بات کرتے ہیں کیونکہ اس سوال کا جواب کہ کیا ماضی کی خلافتیں، خلافتیں تھیں یا نہیں، اس چیز کو سمجھنے میں ہے کہ دارالاسلام کب دارالکفر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور آج کوئی بھی قائم ہونے والی اتھارٹی جو اپنے آپ کو اسلامی کہتی ہو، اس کے اسلامی ہونے کا فیصلہ بھی اس بات کے تعین میں ہے کہ کب دارالکفر، دارالاسلام میں تبدیل ہو جاتا ہے، کیونکہ آج دارالاسلام کا قیام دراصل دارالکفر کے دارالاسلام بننے کا عمل ہے۔

جہاں تک دارالاسلام کے دارالکفر میں تبدیل ہونے کا تعلق ہے، تو یہ ان دو شرائط میں سے کسی ایک یا دونوں شرائط کے مفقود ہو جانے سے ہوتا ہے کہ جو کسی اتھارٹی کے دارالاسلام ہونے کے لیے درکار ہیں۔ اول: جب اس علاقے کی امان مسلمانوں کی بجائے کفار کے ہاتھ میں چلی جائے، دوئم: وہاں اسلام کی بجائے کفر کے احکامات کے ذریعے لوگوں کے معاملات چلائے جائیں۔ یہاں امان سے مراد اس دار یا علاقے کا اندرونی و بیرونی تحفظ ہے، اور کفر سے مراد یہ ہے کہ جس کے کفر ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ ہو۔ یعنی اس کا کفر ہونا ایک قطعی امر ہو، نہ کہ یہ کوئی فقہی لحاظ سے ایک مختلف فیہ معاملہ ہو۔

اس بناء پر جب ہم ماضی کی خلافتوں کو دیکھتے ہیں تو یہ بات تو بدیہی ہے کہ اُن ادوارِ خلافت میں امان مسلمانوں کے ہاتھ ہی میں رہی اور جہاں تک نافذ العمل احکامات کا تعلق ہے تو خلافت میں کفریہ احکامات رائج نہیں تھے اور لوگوں کے امور کی دیکھ بھال اسلام کے احکامات کے ذریعے کی جارہی تھی، خواہ اسلام کے احکامات کی سمجھ کسی خاص دور میں کتنی ہی کمزور کیوں نہ رہی ہو۔ حکمرانوں کا ظلم کفریہ احکامات کے رائج ہونے میں داخل نہیں۔ اگر کسی حکمران نے بغاوت کو کچلنے کے لیے تلوار کو چلانے میں زیادتی کی یا کسی کا مال ناحق چھین لیا، یا امت کے مال میں سے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے فائدہ حاصل کیا، یا کسی کو معصیت پر مبنی حکم دیا، تو اس نے حرام عمل کیا، مگر یہ کفر بواح نہیں۔ طرف داری کرتے ہوئے اپنے کسی رشتے دار پر حد جاری نہ کرنے میں اور حدود کو دقیانوسی اور آج کے لحاظ سے ناقابل نفاذ قرار دے کر معطل کر دینے میں فرق ہے۔ خود شراب پینے میں اور شراب، سود اور زنا اور جوئے کو قانوناً حلال قرار دینے میں فرق ہے۔ حذیفہ بن یمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(يَكُونُ بَعْدِي أَئِمَّةٌ لاَ يَهْتَدُونَ بِهُدَايَ وَلاَ يَسْتَنُّونَ بِسُنَّتِي وَسَيَقُومُ فِيهِمْ رِجَالٌ قُلُوبُهُمْ قُلُوبُ الشَّيَاطِينِ فِي جُثْمَانِ إِنْسٍ قَالَ: قُلْتُ: كَيْفَ أَصْنَعُ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنْ أَدْرَكْتُ ذَلِكَ قَالَ: تَسْمَعُ وَتُطِيعُ لِلأَمِيرِ وَإِنْ ضُرِبَ ظَهْرُكَ وَأُخِذَ مَالُكَ فَاسْمَعْ وَأَطِعْ) "میرے بعد ایسے حکمران بھی ہوں گے جو نہ میری ہدایت سے راہنمائی لیں گے نہ ہی میری سنت کو اپنائیں گے۔ ان میں ایسے لوگ بھی آئیں گے جن کے دل انسانی جسم میں شیطان کے دل ہوں گے۔ کہا: اے اللہ کے رسول! اگر میں وہ دیکھوں تو کیا کروں فرمایا: امیر کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو چاہے وہ تمہاری پشت پر کوڑے مارے اور تمہارا مال کھالے پھر بھی تم سنو اور اطاعت کرو"** (مسلم)، ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(يَا أَبَا ذَرٍّ كَيْفَ أَنْتَ عِنْدَ وُلَاةٍ يَسْتَأْثِرُونَ عَلَيْكَ بِهَذَا الْفَيْءِ قَالَ وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ أَضَعُ سَيْفِي عَلَى عَاتِقِي فَأَضْرِبُ بِهِ حَتَّى أَلْحَقَكَ قَالَ أَفَلَا أَدُلُّكَ عَلَى خَيْرٍ لَكَ مِنْ ذَلِكَ تَصْبِرُ حَتَّى تَلْقَانِي)** "اے ابوذر! تم اس وقت کیا کرو گے جب ایسے والی ہوں گے جو مالِ فیئ کو لوگوں کو دینے کی بجائے اپنے پاس رکھ لیں گے۔ کہا اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، میں اپنی تلوار اپنے کندھے پر رکھوں گا اور اس

سے ماروں گا یہاں تک کہ آپ سے آملوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، کیا میں اس سے بہتر بات تمہیں نہ بتاؤں، صبر کرو یہاں تک کہ تم مجھ سے آملو" (احمد)۔

ایک حکمران کا خود معصیت کرنا مگر اسلام ہی کو نافذ کرنا، ایک حکمران کا کسی خاص موقع پر کسی ریاستی اہلکار کو معصیت کے کام کا حکم دینا، ایک حکمران سے کفر بواح کا ظاہر ہونا، ایک حکمران کا اقتدار کو غصب کر لینا، ایک حکمران کا کفریہ تصورات کی بنیاد پر لوگوں کے امور کی دیکھ بھال کرنا؛ یہ سب مختلف حقیقتیں ہیں جن کے لیے شریعت میں حکم موجود ہے۔ جن لوگوں نے تاریخ کے بعض واقعات کو بنیاد بناتے ہوئے خلافت کے سابقہ ادوار کو خلافت ماننے سے انکار کیا ہے، تو جہاں انہوں نے تاریخ کو اخذ کرنے کے لیے غلط اصولوں کا سہارا لیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ان ادوار کا جائزہ لیتے ہوئے اسلام کے حکمرانی کے قانونی پہلو کو بھی نظر انداز کیا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ لوگ ریاست کے متعلق مغرب کے تصور سے بھی متاثر ہیں۔ یہ طے کرنے کی بجائے کہ آیا ان ادوار میں مسلم سرزمینیں دار الاسلام تھیں یا دار الکفر اور اس کے مستند ثبوت کیا ہیں، انہوں نے سابق خلفاء کے دور کے مستند و غیر مستند واقعات کے ذریعے اس دور کے حکمرانوں کے ظلم، معصیت اور کرپشن کے واقعات اور اسلام کے سوءِ نفاذ کی فہرستیں مرتب کرنے کی کوشش کی، تاکہ قارئین کو اپنے موقف کے حق میں متاثر کیا جائے۔

یہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ خلیفہ کی طرف سے کفر بواح کے ظاہر ہو جانے سے ریاستِ خلافت فوراً ایک کفریہ ریاست یا دار الکفر نہیں بن جاتی۔ جہاں تک دار الاسلام میں کفر بواح کے ظہور اور دار الاسلام کے دار الکفر بن جانے میں فرق کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں پہلے تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کفر بواح سے مراد کیا ہے۔ جب ہم ان احادیث کو دیکھتے ہیں کہ جو حکمران سے کفر بواح کے ظہور سے متعلق ہیں، ان میں صرف کفر بواح کی بات نہیں کی گئی بلکہ بیان کیا گیا کہ ایسا کفر جس کے کفر ہونے کی تمہارے پاس قطعی دلیل موجود ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے **الا ان تروا کفراً بواحاً** "ماسوائے یہ کہ تم کھلم کھلا کفر دیکھ لو" کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ یہ فرمایا: **عِندَكُم مِن اللهِ تَعَالى فِيه بُرهَان** "جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے برہان

موجود ہو" (بخاری) اور لفظ برھان کا اطلاق قطعی دلیل پر ہی ہوتا ہے۔ اگر اس بات کا شبہ و احتمال موجود ہو کہ یہ کفر نہیں، تو یہ وہ کفر بواح نہیں کہ جس پر حکمران کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ "کفراً بواحاً" کے دو الفاظ جو حدیث میں وارد ہوئے ہیں **نکرۃ موصوفہ** ہیں، جن کی دلالت ہر اُس چیز پر ہے کہ جس کی یہ حقیقت ہو کہ یہ کفر بواح ہے۔ لفظ بواح، باح، بوحاً سے ہے جس کے لفظی معنی ہیں ظاہر ہونا، یعنی ایسا کفر جو "ظاہر اور واضح" ہو جائے۔ کفر بواح تین صورتوں میں ہوتا ہے:

1) حکمران عقیدتاً کافر ہو جائے اور اپنے کفریہ عقیدے کو ظاہر کر دے۔

2) دار الاسلام میں بسنے والے کچھ مسلمان مرتد ہو جائیں اور حکمران اس پر عدم قبولیت کا اظہار نہ کرے۔ کیونکہ حدیث میں کفراً بواحاً، نکرہ موصوفہ آیا ہے، یعنی کوئی بھی کفر بواح۔ یعنی یہ لازم نہیں کہ کفر بواح کا اظہار حکمران کی طرف سے ہی ہو۔ جو واحد قید جو حدیث میں عائد کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایسا کفر ہو جو کہ "بواحاً" یعنی ریاست میں ظاہر و معلوم ہو اور اس کا انکار یعنی مذمت و روک تھام نہ کی جائے۔ (جہاں تک اہلِ ذمہ کفار اور مستامنین کا تعلق ہے تو ان کا دار الاسلام میں اپنی حالتِ کفر کے ساتھ موجود ہونا اور ان کی کفریہ عبادت گاہوں کا دار الاسلام میں پایہ جانا، جزیہ و امان کے حکم کی وجہ سے اس صورتِ حال سے مستثنیٰ ہے)۔

3) حکمران اسلام کے قطعی احکامات کا انکار کر دے مثال کے طور پر وہ یہ اعلان کرے کہ آج سے شراب پینے اور شراب خانے کھولنے کی اجازت ہے کیونکہ اللہ نے شراب کو حرام نہیں کیا ہے اور اس حکم کو نافذ کرنے کے لیے ریاستی قوت تعینات کر دے، تو یہ کفر بواح ہے کیونکہ یہ قرآن کی قطعی الثبوت قطعی الدلالۃ آیت کا انکار ہے، جو کہ کفر ہے جیسا کہ شیخ تقی الدین نے کتاب نظامُ الاسلام میں کے پہلے باب میں عقیدہ کی بحث میں بیان کیا ہے: [قطعی طور پر ثابت کسی بھی تفصیلی حکم کا انکار کفر ہے، خواہ ان احکامات کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، عقوبات سے ہو یا مطعومات سے ۔ پس جس طرح اس آیت کا انکار کفر ہے: **وَاَقِيْمُوا الصَّلَاةَ "اور نماز قائم کرو"** (البقرہ: 43)، بالکل اسی طرح اس آیت کا انکار بھی کفر ہے:

اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا "اللہ نے تجارت کو حلال کردیا ہے اور سود کو حرام کردیا ہے"(البقرہ:275)،اور جس طرح اس آیت کا انکار کفر ہے: **اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا "چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو"**(المائدۃ:38)،اسی طرح اس آیت کا انکار بھی کفر ہے: **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ "تم پر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ حرام کردیا گیا ہے"**(المائدۃ:3)]۔ اسی طرح اگر ایک حکمران اسلام کے قطعی حکم کو اس بنا پر معطل کردے کہ یہ آج کے دور کے لیے موزوں نہیں ہے۔ یا حکمران اسلامی قوانین کی بجائے کسی اور قانون کو بہتر سمجھتے ہوئے اختیار کرلے تو یہ کفر بواح کا ظہور ہے، اور ایسے حکمران پر اس آیت کا اطلاق ہوتا ہے: **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ "اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے ذریعے فیصلے نہ کرے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں"**(المائدہ:44)۔

دارالاسلام میں کفر بواح کے ظاہر ہونے اور دارالاسلام کے دارالکفر بن جانے میں فرق یہ ہے کہ کفر بواح کا نظر آجانا وہ دَور ہے کہ جب دارالاسلام میں کفریہ احکامات کو رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ اسے دارالکفر میں تبدیل کردیا جائے۔ لیکن جب کفریہ قوانین رائج ہوجائیں، فیصلے انہی قوانین کے مطابق ہونے لگیں، وہ منکر نہ رہیں بلکہ معروف بن جائیں اور معاشرے میں مستحکم ہوجائیں، ان کی خلاف ورزی کرنا جرم سمجھا جائے تو اب اس دار کی حقیقت دارالاسلام میں کفر بواح کے ظاہر ہونے سے تبدیل ہوکر دارالکفر کی ہوگئی۔ آج اسلامی علاقوں میں ہمیں یہی صورتِ حال نظر آتی ہے کہ جہاں ریاست کو خالصتاً اسلامی عقیدہ کی بجائے انسان کے قانون سازی کے حق، لبرل آزادیوں، مرد و عورت کی مساوات، بنیادی انسانی حقوق جیسے کفریہ تصورات پر استوار کیا گیا ہے اور اس میں کچھ اسلامی تصورات بھی شامل کیے گئے ہیں، پس ڈکٹیٹر یا پارلیمنٹ انہی تصورات کی بنیاد پر قوانین بناتے ہیں اور انہیں معروف سمجھا جاتا ہے، اور ریاستی قوت کے زور پر ان قوانین کو نافذ کیا جاتا ہے، عدالتیں انہی کی بنیاد پر فیصلے کرتی ہیں، یوں لوگوں کے امور کی دیکھ بھال ان کفریہ تصورات کی بنیاد پر بنائے جانے والے قوانین کے ذریعے کی جارہی ہے۔

بعض لوگوں کا یہ کہنا درست نہیں کہ ریاست نے تو اپنے آئین میں اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو طے کر دیا، اگر ایک حکمران آئین میں طے کردہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو نافذ نہیں کرتا تو یہ حکمران کا قصور ہے اس سے وہ ریاست کفریہ ریاست یا دارالکفر نہیں بنتی۔ یہ کہنا اس وجہ سے درست نہیں کیونکہ اسلام میں حکومت و ریاست کی تقسیم نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ قرار دیا: **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ "اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے ذریعے فیصلے نہ کرے تو ایسے لوگ ہی کافر ہیں"**، تو یہاں حکمران کی حکمرانی اور فیصلوں کے متعلق حکم بیان کیا گیا ہے خواہ یہ فیصلے آئین کی وجہ سے ہوں یا کسی اور وجہ سے، جب یہ نفاذ اس اعتقاد کے ساتھ ہو کہ اسلام کے احکامات آج کے دور کے لیے قابل عمل نہیں یا انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین اسلام کے قوانین سے بہتر ہیں۔ پھر اسلام نے کفر بواحاً کو بھی مطلقاً بیان کیا ہے، خواہ اس کا اظہار ریاست کے آئین کے ذریعے ہو یا حکمران کے افعال کے ذریعے ہو یا معاشرے میں بلا روک ٹوک کفر کے پھیل جانے کی صورت میں ہو۔ یہ امر اس کے علاوہ ہے کہ آئین کو جن تصورات کو درست مان کر، مختلف شقوں پر مرتب کیا گیا ہے وہ کفریہ تصورات ہیں، جیسا کہ انسان کے لیے قانون سازی کا حق، بنیادی انسانی حقوق، پرامن بقائے باہمی، مرد و عورت کی مساوات، اقوامِ متحدہ اور بین الاقوامی قانون کی پاسداری وغیرہ۔

چونکہ دارالاسلام میں کفر بواح کا ظاہر ہونا، اور دارالاسلام کا دارالکفر میں تبدیل ہو جانا دو الگ حقیقتیں ہیں اس لیے دونوں کے لیے شریعت میں الگ الگ حکم دیا گیا ہے، یعنی دونوں کی مناط فرق ہے اور یہ ایک معروف امر ہے کہ مناط کے تبدیل ہونے سے حکم تبدیل ہو جاتا ہے۔ مناط کے فرق کو سمجھنے کے لیے ہم حدیث کے الفاظ پر غور کرتے ہیں: **بَايَعْنَا رسول الله -صلى الله عليه وسلم -على السَّمع والطَّاعَة في العُسْر واليُسْر، والمَنْشَطِ والمَكْرَه، وعلَى أَثَرَة عَلَينا، وعلى أَن لاَ نُنَازِعَ الأَمْر أَهْلَه إِلاَّ أَن تَرَوْا كُفْراً بَوَاحاً عِندَكُم مِن الله تَعَالى فِيه بُرهَان، وعلى أن نقول بالحقِّ أينَما كُنَّا، لا نخافُ فِي الله لَوْمَةَ لائِمٍ** "عبادہ بن صامتؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس بات پر بیعت کی کہ مشکل اور آسانی میں، خوشی اور غمی میں اور خود پر ترجیح دیے جانے کی صورت میں بھی سنیں گے اور اطاعت

کریں گے۔ اور اس بات پر بیعت کی کہ ہم اقتدار کے معاملے میں اصحاب اقتدار سے تنازع نہیں کریں گے۔ (آپ ﷺ نے فرمایا:) سوائے اس کے کہ تم کھلم کھلا کفر دیکھو، جس کے (کفر ہونے پر) تمھارے پاس (قرآن اور سنت سے) برھان موجود ہو"۔ یہ حدیث دو حالتوں کو بیان کر رہی ہے، پہلی حالت کہ جب حکمران کے خلاف تلوار اٹھانا جائز نہیں تھا، بلکہ خوشی و غمی اور تنگی و آسانی میں بھی سمع واطاعت کا حکم تھا کیونکہ کفر کا ظہور نہیں ہوا تھا اور پھر دوسری حالت کہ جب تلوار اٹھانا جائز ہو گیا کیونکہ کفر کا ظہور ہو گیا۔ یعنی یہ حدیث اس حقیقت کے متعلق ہے کہ ایک دارالاسلام موجود تھا جہاں حکمران "ماانزل اللہ" کے ذریعے حکمرانی کر رہا تھا، قطع نظر یہ کہ کچھ معاملات بعض لوگوں کو ناپسند تھے، یہاں تک کہ اس سے کفر کا ظہور ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حزب حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کو منہج کے طور پر اختیار نہیں کرتی، کیونکہ مسلم علاقوں کی حقیقت دارالاسلام میں کفر کے ظاہر ہو جانے کی نہیں، یعنی ایسا نہیں کہ پہلے اسلام کی بنیاد پر سمع واطاعت ہو رہی تھی اور اب کفر ظاہر ہو گیا۔ بلکہ آج مسلم علاقوں کی حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کے سب دارالکفر ہیں۔ جیسا کہ مکہ دارالکفر تھا، جہاں عرصہ دراز سے کفریہ قوانین رائج تھے، کفر ہی وہاں کا عرف تھا اور کفر ہی مستحکم و غالب تھا، لوگوں کے باہم تعلقات کفر کی بنیاد پر ہی استوار تھے۔ پس رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مکہ کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی بلکہ **فکری و سیاسی جدوجہد (صراح الفکری و کفاح السیاسی)** اور **طلبِ نصرۃ** کا کام کیا۔ دارالاسلام میں کفر بواح ظاہر ہونے کی مثال مصطفےٰ کمال کی ہے کہ جس نے خلافت کو ختم کر کے سیکولر جمہوری ریاست کی بنیاد رکھی اور کفریہ قوانین کے ذریعے حکمرانی شروع کر دی۔ اور وہی وہ وقت تھا کہ مسلمانوں میں سے کوئی اٹھتا اور اسے قتل کر دیتا اور نبی کریم ﷺ کے بیان کردہ حکم کو پورا کر دیتا، اور یوں ترکی کو دارالاسلام سے دارالکفر میں تبدیل ہونے کو روک دیا جاتا۔

علاوہ ازیں حدیث میں یہ الفاظ لائے گئے، **أَن لاَ نُنَازِعَ الأَمْرَ أَهْلَه "ہم ان لوگوں سے تنازعہ نہیں کریں گے کہ جو امر کے اہل ہیں"**۔ یعنی یہ حدیث ان حکمرانوں کے متعلق ہے کہ جنہیں اسلام اہلِ امر کے طور پر تسلیم کرتا ہے، یعنی جو اسلام کے نفاذ اور رضامندی و اختیار کی بیعت کی وجہ سے مسلمانوں کی حکمرانی کے اہل تھے۔ اور یہ

حدیث بیان کر رہی ہے کہ ان اہل امر سے پھر اس کے بعد جب کفر بواح ظاہر ہو جائے تو اب کیا کرنا ہے۔ جبکہ آج کے حکمران اسلام کی رُو سے سرے سے اہل امر ہیں ہی نہیں، پس ان پر اس حدیث کے حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔

پاکستان کے واضح طور پر دار الکفر ہونے کے باوجود پاکستان کے کئی علماء پاکستان کو دار الکفر قرار دینے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کی دو وجوہات بیان کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر پاکستان کو دار الکفر قرار دے دیا جائے تو پھر حکمرانوں کے خلاف تلوار اٹھانا واجب ہو جائے گا جس سے فتنہ پھیلے گا، اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے علاقوں کو دار الکفر مان لینے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ کفار سے ان علاقوں کا دفاع کرنا واجب نہیں رہے گا کیونکہ مسلمانوں کی ذمہ داری دار الاسلام کو کفار کے ہاتھوں میں جانے سے روکنا ہے نہ کہ ایک ایسا علاقے کا دفاع کرنا جو پہلے سے ہی دار الکفر ہو۔ روایتی علماء کا طرزِ استدلال دار الکفر کے اور دار الاسلام میں حکمرانوں کی طرف سے کفر بواح کے ظہور کی حقیقت کے درمیان فرق کو نہ سمجھنے اور دار الکفر کو دار الاسلام میں تبدیل کرنے کے شرعی طریقہ کار سے واقف نہ ہونے کا نتیجہ ہے ۔ برطانیہ اور پاکستان دونوں دار الکفر ہیں مگر پاکستان میں امان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے جبکہ برطانیہ میں کفار کے ہاتھوں میں۔ اور مسلمانوں کی امان کو کفار کے حوالے کرنا جائز نہیں۔ امان اس دار میں موجود اتھارٹی اور اس کی عسکری قوت کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے۔ امان کو کفار کے حوالے کرنے کا مطلب کفار کی اتھارٹی کا مسلمانوں پر قائم کرنا ہے جبکہ مسلمانوں پر کفار کو دسترس اور غلبہ فراہم کرنا حرام ہے کیونکہ ارشاد ہے: **وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلاً "اللہ تعالیٰ نے کفار کو مسلمانوں پر کوئی اختیار یا غلبہ نہیں دیا"** (النساء:141)۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ مسلمانوں کا اولی الامر اُنہی میں سے ہو، یہ کوئی کافر نہیں ہو سکتا، کیونکہ ارشاد ہوا: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسول کی اور اپنے میں سے اہلِ اقتدار کی"** (النساء: 59)۔ گویا امان کا مسلمانوں کے ہاتھ میں ہونا مسلمانوں پر فرض ہے اور اپنی جگہ ایک مستقل حکم ہے اور اس حکم پر عمل درآمد اسلام کے نفاذ سے مشروط نہیں ہے، اگرچہ دونوں احکامات کا پورا کرنا لازمی ہے۔ اسلام کا عدم نفاذ حرام ہے مگر یہ ایک اور حرام عمل کو کر گزرنے (یعنی امان کو بھی کفار کے حوالے کر دینے) کا جواز نہیں۔ اور پھر نصِ قرآن براہِ راست اس بات کا حکم دیتی ہے کہ جب کفار

مسلمانوں پر زیادتی کریں تو ان کا جواب دیا جائے۔ ارشاد ہوا: **فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ** "پھر جو تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسا کہ اس نے تم پر کی"(البقرۃ:194)۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کب ایک کفریہ ریاست ایک اسلامی ریاست میں تبدیل ہو جاتی ہے، تو یہ کسی علاقے میں کہ جو دار الکفر تھا دار الاسلام کے لیے درکار شرائط کے پورا ہونے سے ہوتا ہے، اور یہ شرائط دو ہی ہیں جیسا کہ اوپر بیان کی گئیں، یعنی یہ کہ اس علاقے کی امان مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور دوسرے یہ کہ وہاں تمام تر حکمرانی اسلام کے احکامات کے ذریعے کی جارہی ہو۔ یہ دو شرائط فقہاء میں مشہور و معروف تھیں۔ مگر آج چونکہ مسلمانوں کے ذہن سے یہ محو ہو گیا ہے کہ تمام تر حکمرانی اسلام کے مطابق ہونے سے کیا مراد ہے، پس حزب کو یہ بیان کرنا پڑا کہ ایسی ریاست کی شکل وہئیت کیا ہو گی، اس ریاست میں حکمرانی کے اصول کیا ہوں گے، وہ ایک قومی ریاست ہو سکتی ہے یا نہیں، اس کی خارجہ پالیسی کا دعوت و جہاد پر مبنی ہونا کیوں ضروری ہے، کیا ایسی ریاست ایک سے زیادہ دار الاسلام ہونے کو تسلیم کر سکتی ہے یا نہیں۔ اور وہ کون سے اسلامی افکار ہیں کہ جو ریاست اور حکمرانی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ کیونکہ جس طرح ایک کافر کا اس بنا پر اسلام کے احکامات پر عمل کرنا اسے مسلمان نہیں بناتا کہ یہ فائدہ مند اور عملی ہیں، جب تک کہ وہ اسلام پر ایمان لاتے ہوئے ان احکامات کو اختیار نہ کرے، اسی طرح اگر ایک ریاست اسلام کو ریاست کی بنیاد مانتے ہوئے، اسلام کو تمام تر ریاستی امور کی بنیاد نہ بنائے تو وہ ریاست بدستور ایک کفریہ ریاست ہی رہے گی، خواہ وہ اسلام کے کچھ قوانین کو نافذ بھی کر رہی ہو۔ پس حزب نے ریاستِ خلافت کے مسودہ دستور کا آغاز ہی اس شق سے کیا کہ اسلامی عقیدہ ہی اسلامی ریاستِ خلافت کی بنیاد ہوتا ہے۔ اور اس بات کو واضح کر دیا کہ ریاست کی بنیاد محض قوانین پر نہیں ہوتی بلکہ افکار و تصورات پر ہوتی ہے۔ ایک ریاست کا دستور یا آئین اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ اس ریاست کی بنیاد کن نظریات پر ہے۔ لہذا آج کے دور میں کہ جب ریاستیں مختلف انواع کے کفریہ تصورات پر استوار ہیں اور اسلام کے سیاسی تصورات میں اجنبی تصورات کی آمیزش ہو چکی ہے، ضروری ہے کہ کوئی بھی دار جو کہ اپنے آپ کو دار الاسلام کے طور پر پیش کرتا ہے وہ اپنے آئین کا مسودہ امت کے سامنے پیش کرے۔ حزب ریاست کے اسی ڈھانچے اور نظاموں

کی تفصیلات کو درست سمجھتی ہے جسے اس نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے، تاہم وہ اس بات کی گنجائش رکھتی ہے کہ اس میں آراء کے اختلاف کی گنجائش ہے۔ اور جس طرح حسنؓ امت کی وحدت کی خاطر امیر معاویہؓ کے حق میں دستبردار ہو گئے، اگرچہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ خلافت کے زیادہ حق دار ہیں، حزب بھی اس بات کے لیے تیار ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی ایسے گروہ یا جماعت کی طرف سے دارالاسلام کے قیام کو قبول کرلے کہ جس کا ریاستی ڈھانچہ اور نظاموں کی تفصیل حزب سے کچھ مختلف ہو، مگر یہ لازم ہے کہ وہ گروہ اسلام سے اس کے لیے دلیل پیش کرے۔ جی ہاں! اسلام میں اختلاف کی گنجائش ہے مگر یہ گنجائش بہت وسیع نہیں ہے۔ پس جس کے پاس حزب کے بیان کردہ ریاستی ڈھانچے اور نظام ہائے حیات کے علاوہ اسلامی ریاست کا ایسا خاکہ موجود ہے، جسے اس نے شرعی نصوص سے شرعی اجتہاد کے ذریعے مستنبط کیا ہو تو وہ اسے پیش کرے۔

فہرست

اِن حکمرانوں سے نجات کے لیے دوبارہ نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت قائم کرو، جو ہمیں تباہ کن مغربی عالمی آرڈر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں

حزب التحریر-ولایہ پاکستان

یہ بات واضح ہے کہ موجودہ نظام کے تحت رہتے ہوئے حقیقی تبدیلی ناممکن ہے۔ جن لوگوں نے مسلم لیگ-ن اور پاکستان پیپلز پارٹی کی کرپشن سے نجات حاصل کرنے کے لیے عمران خان کی پی ٹی آئی کو ووٹ دیا تھا، آج وہ مایوسی کے عالم میں اپنے سر پکڑے بیٹھے ہیں۔ صورتحال اس قدر خراب ہے کہ لوگ پچھلے کرپٹ حکمرانوں کو ایک بار پھر قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے ہیں۔ لیکن پچھلے اور موجودہ حکمرانوں کی ناکامی کی وجہ ایک ہی ہے۔ یہ سب ہمیں تباہ کن مغربی عالمی آرڈر (Western World Order) کے شکنجے میں جکڑتے ہیں اور اس ظالمانہ آرڈر کی بنیاد پر ہی حکومت کرتے ہیں۔

اے پاکستان کے مسلمانو! سابقہ اور موجودہ حکمران، دونوں ہی اُس عالمی آرڈر کے رکھوالے ہیں جسے مغرب نے 28 رجب 1342 ہجری، بمطابق 3 مارچ 1924 کو خلافت کے خاتمے کے بعد مسلم دنیا پر مسلط کیا تھا۔ یہ مغرب زدہ حکمران ہمیں اسی مغربی عالمی آرڈر کے تحت قائم کی گئی قومی ریاستوں کے پنجروں میں قید رکھتے ہیں۔ ان حکمرانوں میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ یہ مغربی طاقتوں اور ان کے آلہ کار اداروں یعنی آئی ایم ایف، عالمی بینک، اقوام متحدہ، ایف اے ٹی ایف، اور عالمی عدالت انصاف سے ہٹ کر کچھ سوچیں۔ یہ آئی ایم ایف کی اطاعت گزاری ہی ہے کہ جس کی وجہ سے ہم معاشی بدحالی کا شکار ہیں۔ یہ ایف اے ٹی ایف FATF کی اطاعت گزاری ہی ہے کہ جس کی وجہ سے مقبوضہ کشمیر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا، یہ امریکی محکمہ خارجہ کی اطاعت گزاری ہی ہے کہ جس نے مودی کو طاقتور ہونے کا موقع فراہم کیا اور یہ حکمرانوں کی امریکی پینٹاگون اور

سی آئی اے کی اطاعت گزاری ہی ہے کہ جس کی وجہ سے افغانستان کے مسلمان بدحالی سے دوچار ہیں۔

مغرب زدہ حکمران ہمیں اس مغربی معاشی آرڈر کی زنجیروں میں جکڑتے ہیں جو مسلم دنیا کو غریب اور محتاج بنائے ہوئے ہے، جبکہ مسلم دنیا میں کئی اقسام کے بیش بہا وسائل موجود ہیں۔ یہ مغربی معاشی آرڈر ہی ہے جس نے اس بات کو یقینی بنایا کہ مسلم دنیا سونے اور چاندی کو بطور کرنسی استعمال کرنے سے دستبردار ہو جائے، اگرچہ اس کے نتیجے میں صدیوں قیمتیں مستحکم رہیں اور ہمیں کبھی آج جیسی کمر توڑ مہنگائی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ مغربی معاشی آرڈر ہی ہے جس نے اس بات کو یقینی بنایا کہ سودی لین دین اور سودی قرضوں کی اجازت ہو جبکہ سود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے اعلانِ جنگ کو دعوت دیتا ہے۔ اس سود نے بہت بڑا قومی قرض پیدا کر دیا ہے جو ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے اور جو ریاست کے محصولات (آمدنی) کا بڑا حصہ کھا جاتا ہے۔ اور یہ کفار کا معاشی آرڈر ہی ہے جو توانائی اور معدنیات کے خزانوں کی نجکاری کو یقینی بناتا ہے، جس سے دولت کی گردش رُکتی ہے اور پورے معاشرے کی ضروریات پوری نہیں ہو پاتیں کہ جنہیں پورا کرنے کا اسلام نے حکم دیا ہے۔

مغرب زدہ حکمران ہمیں مغربی سیاسی آرڈر کی زنجیروں میں جکڑتے ہیں جس نے مسلمانوں کو 60 سے زائد ریاستوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اِس سے پہلے صدیوں تک اس امت نے ایک خلافت تلے دنیا پر حکمرانی کی تھی، جس کے سائے تلے امت کی افواج اور وسائل یکجا تھے۔ یہ مغرب زدہ حکمران کبھی اس بات کی دعوت نہیں دیں گے کہ مسلمانوں کو تقسیم کرنے والی استعماری سرحدوں کو ختم کر دیا جائے کہ جس کے نتیجے میں مسلمان یکجا اور اپنے دشمنوں کے سامنے طاقتور اور مضبوط ہو جائیں۔ یہ منافق حکمران امت کے اتحاد کا مطالبہ محض امت کو دھوکہ دینے اور ان کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں کیونکہ امت میں شدید خواہش موجود ہے کہ مسلمان یکجا ہوں جس کا منطقی نتیجہ خلافت کے قیام کا مطالبہ ہے۔ یہ بات نہایت واضح ہے کہ یہ حکمران فلسطین، مقبوضہ کشمیر، برما اور چین کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے کچھ بھی نہیں کرتے۔

یہ مغرب زدہ حکمران ہمیں مغربی سیکولر، لبرل آرڈر کی زنجیروں میں جکڑتے ہیں جو ایسے کسی بھی آئین کی تشکیل سے روکتا ہے جو مکمل طور پر صرف قرآن پاک اور سنت رسول اللہ ﷺ سے اخذ کیا گیا ہو۔ مغرب زدہ حکمران خلافت کے نظامِ حکمرانی کو کبھی نافذ نہیں کریں گے کیونکہ اُن کی نظر مغرب کے قدیم وجدید نظام حکمرانی، یعنی بادشاہت، آمریت اور جمہوریت، اور ان کے مختلف ملغوبوں، کے علاوہ کچھ اور دیکھنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا یہ کبھی اس بات کو یقینی نہیں بنا سکتے کہ ہماری معیشت، خارجہ پالیسی، تعلیم، حکمرانی اور خاندانی اقدار صرف اور صرف قرآن وسنت کے مطابق ہوں جس سے اللہ سبحانہ وتعالیٰ راضی ہو اور ہم اُس کے غضب سے بچ سکیں۔

اے پاکستان کے مسلمانو! نبی آخر الزمان، رسول اللہ ﷺ نے ہمیں خبردار فرمایا تھا، **سَيَأْتِي عَلَى النَّاسِ سَنَوَاتٌ خَدَّاعَاتٌ يُصَدَّقُ فِيهَا الْكَاذِبُ وَيُكَذَّبُ فِيهَا الصَّادِقُ وَيُؤْتَمَنُ فِيهَا الْخَائِنُ وَيُخَوَّنُ فِيهَا الأَمِينُ وَيَنْطِقُ فِيهَا الرُّوَيْبِضَةُ قِيلَ وَمَا الرُّوَيْبِضَةُ قَالَ الرَّجُلُ التَّافِهُ فِي أَمْرِ الْعَامَّةِ" مکر و فریب والے سال آنے والے ہیں، جن میں جھوٹے کو سچا سمجھا جائے گا اور سچے کو جھوٹا، خائن کو امانت دار اور امانت دار کو خائن، اور اس زمانہ میں 'رُوَيْبِضَةُ' معاملات کا فیصلہ کریں گے، آپ ﷺ سے سوال کیا گیا: 'رُوَيْبِضَةُ' کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: حقیر اور کمینے لوگ، جو لوگوں کے معاملات چلائیں گے"**۔ لہٰذا ہم کیسے ان 'رویبضہ' حکمرانوں میں کسی سے بھی خیر کی امید لگا سکتے ہیں جو ہمارے امور کے متعلق اپنا کوئی نقطہ نظر نہیں رکھتے اور محض حقیر اور گھٹیا مغربی نظریۂ حیات اور عالمی آرڈر کے مطابق ہمارے معاملات چلاتے ہیں؟

اے پاکستان کے مسلمانو، ان میں موجود بااثر افراد اور خصوصاً نوجوانو! اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے، **وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِي الأَرْضِ " جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنادے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا "**(النور، 24:55)۔ یقیناً نبوت کے نقش قدم پر خلافت کا قیام صرف اور صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مدد سے ہی ممکن ہے، اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی مدد انہیں ملتی ہے جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اور اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کرتے ہیں۔ لہٰذا اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے دین کو ایک آئین اور ریاست کے شکل میں دوبارہ قائم کرنے کے لیے حزب التحریر کے ساتھ کام کریں۔ یقیناً، اُس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں آئے گی جب تک حزب التحریر کی قیادت میں جدوجہد کرتے ہوئے نبوت کے نقش قدم پر خلافت قائم نہیں ہو جاتی۔

اے پاکستان کے علمائے کرام، انبیاؑ کے ورثاء! اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا، **إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ "اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں"**(فاطر، 35:28)۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے آپ کو جس فضل سے نوازا ہے اُس کے مطابق اپنا کردار ادا کریں۔ آپ ویسا ہی کردار ادا کریں جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابن حنبلؒ نے ادا کیا تھا، جنہوں نے کسی بھی درجے میں حکمرانوں کے اسلام سے انحراف پر ان کا احتساب کیا اور اس کے نتیجے میں آنے والی شدید مشکلات و مصائب کو برداشت کیا، مگر ان کی استقامت میں کمی نہیں آئی۔ یہ تھے دورِ خلافت کے علماء، جنہوں نے ایسے

حکمرانوں کے ٹیڑھے پن پر ان کا احتساب کیا جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی وحی کے ذریعے ہی حکمرانی کرتے تھے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی راہ میں جہاد بھی کرتے تھے۔ تو پھر آپ کیسے اِن حقیر اور گھٹیا حکمرانوں کے دور میں خاموش رہ سکتے ہیں جو مسلمانوں کی حرمتوں کو پامال کر رہے ہیں، اور جنہوں نے جہاد اور دیگر شرعی احکامات کو معطل کر دیا ہے؟ آپ کو چاہئے کہ آپ حزب التحریر کے شباب کے ساتھ کھڑے ہوں، جو اِن حکمرانوں اور اِن کی کفریہ حکمرانی، دونوں کو اکھاڑنے کی جدوجہد کر رہے ہیں اور نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت کے دوبارہ قیام کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اے افواجِ پاکستان کے افسران، انصارؓ کے معزز جانشینو! آپ اُن انصار کے وارث ہیں جن کے رہنما سعد بن معاذؓ کو معزز ترین موت نصیب ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، **«اهْتَزَّ عَرْشُ الرَّحْمَنِ لِمَوْتِ سَعْدِ بْنِ مُعَاذٍ» "سعد بن معاذؓ کی موت پر الرحمٰن کا عرش ہل گیا"** (بخاری)۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عرش کے ہل جانے کے حوالے سے ابنِ حجر نے اپنی کتاب فتح الباری میں اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا، والمراد باهتزاز العرش استبشاره وسروره بقدوم روحه "ہلنے سے مراد ہے سعد بن معاذؓ کی روح کے استقبال پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی خوشی"۔ انہیں یہ عظیم موت اس لیے حاصل ہوئی کیونکہ انہوں نے ریاست کی صورت میں دین کے قیام کے لیے نُصرۃ فراہم کی تھی اور پھر اس دین کو دنیا میں پھیلانے کے لیے اللہ کی راہ میں جہاد کیا تھا۔ لہٰذا آج کے جابر حکمرانوں کے خلاف اسِ امت کا ساتھ دے کر اسلام کے ذریعے عزت حاصل کرنے کی جستجو کریں، اور نبوت کے نقشِ قدم پر خلافت کے قیام کے لیے حزب التحریر کو نُصرۃ فراہم کریں

حزبُ التحریر

ولایہ پاکستان

11 جمادی الثانی 1443 ہجری

14 جنوری 2022 عیسوی

فہرست

سائنس اور سائنسی طریقہ کار

کتاب "سرمایہ دارانہ مغربی فکر کا رد، بحیثیت نظریۂ حیات، تہذیب اور ثقافت" سے اقتباس

اگر انسان ہی قانون ساز ہو، جیسا کہ مغرب زور دیتا ہے، تو وہ قوانین کیسے بنائے؟ وہ اپنے علم سے کیسے اخذ کرے؟ حقیقت کو جانچنے کا کیا معیار ہو؟ مذہب کو علم اور طریقہ کار کے ماخذ کے طور پر زندگی سے نکال باہر کرنے کے بعد، مغرب نے نتیجہ خیز طرزِ فکر کے حوالے سے سوالات پوچھے۔ مغرب کا جواب دو نظریات تک ہی محدود تھا: عقلی نظریہ (Rationalist Doctrine) اور تجرباتی نظریہ (Empirical Doctrine)۔ عقلی نظریہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ عقل، حقیقت پر مقدم ہے۔ لہٰذا یہ انسان کے حواس پر انحصار نہیں کرتا بلکہ عقلی توجیح پر علم کے ماخذ کے طور پر انحصار کرتا ہے۔ اس نظریے کے مطابق عقلی توجیح ہی، خواہ وہ ذہن میں اچانک وارد ہونے والے خیال کی بنا پر ہو یا استخراج (deduction) کی بناء پر ہو یا پھر فطری طور پر موجود شعور کے ذریعے ہو، قطعیت اور حقیقت کو جانچنے کا پیمانہ ہے نہ کہ کوئی مشاہدہ یا تجربہ۔ جہاں تک تجرباتی نظریہ (Empirical Doctrine) کا تعلق ہے، تو اس کے مطابق احساسات ہی وہ واحد ذریعہ ہیں جو افکار اور سوچ کو جنم دیتے ہیں۔ یہ نظریہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ تمام سابقہ انسانی علم بھی مشاہدات اور تجربات سے ہی حاصل کیا گیا تھا، یعنی "a posteriori" نہ کہ "a priori"۔ تجرباتی نظریے کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سائنسی تجرباتی طریقہ کار وضع کیا گیا۔ لفظ، Empiricism، قدیم یونانی لفظ empeiria سے ماخوذ ہے، جس کے معنی "تجربہ" کے ہیں، جو حقیقت اور شعور کو ماپنے کے لئے تجربہ پر انحصار کو ظاہر کرتا ہے۔ تجرباتی نقطۂ نظر سے متعدد فلسفے رُونما ہوئے جنہوں نے مغرب میں معاشرے میں نظاموں سے متعلق افکار کو متاثر کیا۔ اسی تجرباتی نقطۂ نظر سے، مادیت پرستی، افادیت پرستی utilitarianism، مثبیت positivism، حقیقت پرستی pragmatism اور دیگر فلسفے اُبھر کر سامنے آئے۔

سائنسی تجرباتی طریقہ کار سے حاصل ہونے والی کامیابیوں اور دریافتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، جنہوں نے مادی طور پر مغرب کی نشاۃِ ثانیہ میں اپنا حصہ ڈالا، مغرب نے اسی طریقہ کار کو تفکیر کے طریقے کے طور پر اپنالیا۔ اس طریقہ کار کو شعور اور حقیقت جانچنے کا واحد پیمانہ بنا کر، اس حد تک قابلِ تعظیم بنا دیا گیا کہ مغرب اسے تقدس کے درجے تک لے گیا۔ مغرب نے تمام معاملات میں اسی سائنسی طریقۂ فکر کو غالب کرتے ہوئے، اسے ہر طرح کی تحقیق کیلئے لاگو کر دیا، یہاں تک کہ انسان، معاشرے اور ان کے تعلقات کے حوالے سے کچھ تحقیق اُسی سائنسی تجرباتی طریقہ کار کے مطابق ہونے لگی، اور نیوٹن کے علمِ میکانیات سے وابستہ نظریۂ جبریت (Determinism) ان معاملات پر بھی لاگو کیا گیا۔ (وقت اور خلاء سے متعلق) نظریۂ مناسبت (Theory of Relativity)، کوانٹم تھیوری، غیر روایتی دریافتوں اور دیگر معاملات کے ظہور کے ساتھ ہی سائنس کے حتمی ہونے اور نظریۂ جبریت کے خلاف بھی سوالات اُٹھنے لگے۔ اس نے بیسویں صدی کے وسط سے، سائنس، تجرباتی طریقہ کار اور نظریۂ جبریت کے خلاف جوابی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ چنانچہ بعض مغربی مفکرین نے سائنس کے رَد کی کوشش کی اور اس کی نمایاں ناکامیوں کو موضوع بنایا، خصوصاً سائنس کا نوعِ انسان کے حوالے سے یہ خیال کہ انسان کا وجود پزیر ہونا مادے کے فطری عمل کا نتیجہ ہے۔ بہر حال، پھر بھی مغرب میں علم پر چھائے رہنے کے ساتھ ساتھ سائنس ہی غالب رہی اور سائنسی طریقہ کار، سوچ و فکر کو جانچنے کا پیمانہ بھی رہا اور تنقید کے لیے معیار بھی اور علم کی بنیاد بھی۔ پس سائنسی فکر یا تنقیدی فکر سے مغرب کی مراد صرف سائنسی تجرباتی طریقہ کار empirical scientific method ہوتا ہے۔

در حقیقت، مغرب کا سائنسی نظریہ دو پہلوؤں سے باطل ہے: ایک تو یہ اپنے آپ میں ایک علم ہونے کے پہلو سے باطل ہے۔ دوسرا یہ اس پہلو سے بھی باطل ہے کہ اسے ہی سوچ و فکر کی بنیاد سمجھا جائے۔

جہاں تک سائنس کو خود ایک علم سمجھنے کا تعلق ہے تو یہ مغرب کے تصورات میں موجود ہے۔ سائنس صرف ایک طریقہ کار ہی نہیں ہے بلکہ ایک حتمی انسانی فہم کے طور پر علم کے حاصل ہو جانے کی ضمانت ہے۔ فلسفۂ مثبیت کے بانی آگسٹے کومٹ (متوفی 1857)، نے سماجی ارتقا کے حوالے سے یہ تجزیہ پیش کیا کہ معاشرہ، تین ادوار کے عمومی

قانون کے مطابق ،اپنی سچائی کی تلاش میں ، تین مراحل سے گزرتا ہے ۔ کومٹ کے مراحل یہ تھے؛ پہلا: مذہبی مرحلہ ،دوسرا: بعد الطبیعات(metaphysical)کا مرحلہ اور تیسرا: مثبیت کا مرحلہ ،جو کہ سائنسی مرحلے کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

مذہبی مرحلے کے دوران ،انسان قدرتی مظاہر کی وضاحت مافوق الفطرت طاقتوں کے ذریعے کرتا تھا، جن کی عکاسی دیوتا کیا کرتے تھے۔ بعد الطبیعیات کے مرحلے میں، یعنی تحقیق (چھان بین) کے مرحلے میں، انسان نے قدرتی مظاہر کے حوالے سے استدلال اور سوالات کرنا شروع کئے ،اس نے فطری عوامل کے بارے میں مذہب اور حکمرانی پر سوالات اٹھائے۔ مثبیت کے مرحلے میں، جو کہ سائنسی مرحلہ ہے، انسان نے تجرباتی طریقہ کار کے ذریعے فطرت کے بارے میں سیکھا۔ انسان نے کائنات کی فطرت کی وضاحت بھی اسی طریقہ سے کی، اور سائنسی اور وضاحتی شکل کے متعلق مثبت علم وضع کیا۔ اس طرح اس طریقہ نے انسان کو فطرت پر غالب ہونے ،اسے قابو میں کرنے اور اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کے قابل بنا دیا۔ آگسٹے کومٹ نے اس بات کا دعوٰی کیا ہے۔ تاہم، ان دعوؤں اور پرچار سے قطع نظر، سائنس بُری طرح ناکام ہوئی ہے۔ سائنس ،انسان کو نوعِ انسانی کے وجود، اس کے کردار اور دنیا میں اس کے مقصد کے بارے میں جامع اور مفصل علم فراہم نہ کر سکی۔ اس کے بجائے، سائنس نے انسان کو صرف مادی علم ہی فراہم کیا جس نے صنعتی اور بعد از صنعتی تہذیب کو جنم دیا۔ بہر حال، سائنس کائنات کے بارے میں اپنی گہری اور معیاری و مقداری توضیحات کے بنا پر ایک منفرد پہچان رکھتی ہے، جو کہ نوعِ انسانی کو فطرت کی صناعیوں سے استفادہ حاصل کرنے میں معاون ہے۔

تاہم، سائنس نے انسان کو اپنے آپ کو جاننے اور انسانیت کی روح و جوہر کو سمجھنے سے دور رکھا ہے اور اپنے وجود اور اپنی تخلیق کا ادراک کرنے سے بھٹکائے رکھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس، انسان کے وجود کے مقصد اور اس کے انجام کی حقیقت، دونوں کے کھوج کو محض فلسفیانہ تحقیق سمجھتی ہے۔ سائنس اس تحقیق کو کاسمولوجی، آنٹولوجی اور مابعد الطبیعات کے دائرہ کار میں رکھتی ہے۔ سائنس اس یقین کو قائم رکھتی ہے کہ مادی حقائق کا ٹھوس علم ہی سبقت

رکھتا ہے، لہٰذا اس کھوج کا کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکل سکتا، اسی لیے اس تحقیق کا کوئی فائدہ نہیں۔ لہٰذا اس طرح سائنس کی نوعیت بیانی تشریح کی ہے، جو دنیائے عالم کو ایک مقدار و ماہیت کے طور پر بیان کرتی ہے۔ لہذا، سائنس توضیح (interpretation) کے بجائے بیان (description) کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ توضیح میں محض بیان سے آگے کے معاملات شامل ہوتے ہیں۔ توضیح، مظاہر کے وجود کے اسباب اور ان کے مقاصد کا مطالعہ ہے۔ سائنس سے کی گئی وضاحت، انسان کو اس کی حقیقت کی وجہ فراہم نہیں کرتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس مقصدِ حیات کی وضاحت کو نظرانداز کرتی ہے۔ یہ کائنات کا صرف معیار و مقدار کے لحاظ سے تجزیہ کرتی ہے۔ سائنس، دنیا کو صرف اس کے اوصاف کے لحاظ سے سمجھنے میں انسانیت کی مدد کرتی ہے۔ تاہم، یہ انسانیت کو اس کے مقصدِ حیات کے متعلق تصورات یا زندگی گزارنے کے اصول فراہم نہیں کرتی۔ اس کی وسعت سے قطع نظر، سائنس کی طرف سے فراہم کردہ علم صرف ایک جزوی علم ہے، جس کا تعلق انسان کے وجود اور اس کی دنیا کے صرف ایک حصے سے ہے۔ سائنس، انسانی حیات کے تمام معاملات اور انسانی وجود کے ہر پہلو کا احاطہ نہیں کرتی۔ اللہ سبحانہ وتعالی فرماتے ہیں، **يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ "وہ بس ظاہری طور پر دنیا کا جینا جانتے ہیں۔ اور وہ آخرت سے بے خبر ہیں"** (سورۃ الروم: 7)۔ ابھی لاتعداد ایسے سوالات موجود ہیں جن کا جواب دینے سے سائنس قاصر ہے؛ جن میں سے سب سے اہم **"کیوں"** سے متعلق ہیں۔ نوعِ انسانی کیوں موجود ہے؟ کائنات کیوں موجود ہے؟ زندگی کیوں موجود ہے؟ انسان اور حیات سے متعلق، یہ سب انتہائی اہم سوالات ہیں۔ انسان کبھی آرام سے نہیں بیٹھ سکتا اور نہ ہی زندگی کے فیصلے کر سکتا ہے، جب تک کہ وہ ان سوالات کے جوابات نہ جان لے، چاہے وہ جوابات ٹھیک ہوں یا غلط۔

اسی سلسلے میں فرانسیسی سیاستدان اور مصنف، آندرے مالراکس André Malraux (متوفی 1976) نے ایک ناول، **"انسان کا مقدر"** لکھا (فرانسیسی نام: La Condition humaine، "انسان کا احوال")، جو کہ انسانیت کے مستقل معانی تلاش کرنے کے ناممکنات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتا ہے، اس میں یہ تبصرہ بھی شامل ہے، "حتیٰ کہ کوئی موت سے بھی گفتگو کر سکتا ہے.... گو کہ یہ بہت ہی مشکل ہے، مگر شاید زندگی کا یہی مطلب

ہے...."۔علاوہ ازیں، ترقی پسندی اور پھیلاؤ بھی سائنسی طریقہ کار کا خاصہ ہیں، جیسا کہ مغربی مفکرین بیان کرتے ہیں۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ تمام تر سائنسی علم ترقی، ارتقاء، لچک اور تبدیلی سے مشروط ہے۔تاہم اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ سائنس حتمی شعور فراہم نہیں کرتی۔ پس اس طرح، انسان کے لئے اپنی زندگی اور اپنے نظاموں کو اس بنیاد پر استوار کرنا ممکن نہیں۔اسی لئے یہ کہنا غلط ہو گا کہ سائنس ایک ایسا علم ہے جو کہ نوعِ انسانی کی حقیقت واضح کرتے ہوئے، زندگی کا معنی متعین کرتا ہے۔

جہاں تک دوسرے پہلو کا تعلق ہے، جو کہ سائنسی طریقہ کو شعور کی بنیاد سمجھنا ہے، تو سائنس کے سوچنے کے طریقہ کار میں ہی بگاڑ ہے۔اس کی خرابی کی کئی وجوہات ہیں، جن میں سے چند ذیل میں ہیں:

اول: سائنسی طریقہ کار، جس موضوع پر تحقیق کی جائے، اس کا صحیح علم حاصل کرنے اور کسی علمی نتیجہ تک پہنچنے کے لئے تحقیق کرنے کا ایک مخصوص طریقہ ہے۔ یہ اپنے مخصوص مراحل پر مشتمل ہوتا ہے: مشاہدہ، استقراء (مفروضات کا وضع کرنا)، استنباط (تجرباتی تشکیل)، جانچ (معلومات جمع کرنا) اور تشخیص (اعداد و شمار کا تجزیہ اور تصوراتی تشکیل)۔ یہ مستند سائنسی طریقہ کار کے مراحل ہیں۔ مغربی مفکرین کے درمیان مشاہدے (observation) کو مفروضہ (hypothesis) پر ترجیح دیئے جانے یا اس کے برعکس مفروضہ کو مشاہدہ پر فوقیت دیئے جانے پر بحث و مباحثے ہوتے رہے ہیں۔اسی لیے مغربی مفکر استقرائی طریقہ (inductive method) کو، جس میں مجسم مشاہدات کو ایک عمومی اصول اخذ کرنے کے لیے ترجیح دی جاتی ہے، استنباطی یا استخراجی طریقہ (deductive method) سے الگ رکھتے ہیں، جس میں منطقی نتیجے تک پہنچنے کے لیے ایک یا ایک سے زیادہ بیانات (مفروضوں) سے استدلال کیا جاتا ہے۔ بہر حال سائنسی طریقہ کار زیادہ تر قدرتی سائنسی موضوعات جیسے فزکس، کیمسٹری اور بیالوجی کے ساتھ ساتھ سوشل سائنس، بشمول سوشیالوجی، مینجمنٹ سائنس، پولیٹیکل سائنس، نفسیات (سائیکالوجی) اور تاریخ جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔

سائنسی طریقہ کہلانے والا یہ طریقہ، انسان کیلئے سوچ و فکر کی بنیاد بننے کے قابل نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنی نوع انسان کیلئے سوچ و فکر کی بنیاد رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ بنیاد تمام انسانیت کی پہنچ میں ہو، تاکہ ہر کوئی اسے اپنی سوچ و فکر کے لیے بنیاد کے طور پر اختیار کر سکے۔ تاہم، سائنسی طریقہ کار در حقیقت ایک پیچیدہ طریقہ ہے جو مخصوص قوانین اور شرائط کے تابع ہے، جس کی تمام انسان نہ تو پابندی کر سکتے ہیں اور نہ ہی پورا کر سکتے ہیں۔ حقیقت میں، سائنسی طریقہ فکر چند مخصوص لوگوں اور گروہوں کے لیے تو فکر کی بنیاد ہو سکتا ہے، لیکن عام عوام کے لیے نہیں۔ اگر علم یا حقائق پر تمام لوگوں کا حق ہے تو فکر عمومی بنیادوں پر ہر کسی کے لیے قابل رسائی ہونی چاہیے تاکہ وہ استفادہ حاصل کرے۔ لیکن سائنسی طریقہ کار کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ مغرب میں سائنسی طریقہ کار کا ظہور اور سماجی طور پر اس کا نمایاں ہو جانا، دونوں ایک انقلابی تنقیدی رجحان پر مبنی تھے کہ جس نے کلیسائی علم کو مسترد کیا۔ مسترد کرنے کی وجہ یہ تھی کہ کلیسا اور پادریوں نے بحث و مباحثہ اور تنقید کی انفرادی آزادیوں کو ضبط کرتے ہوئے عوام کو ان کی مرضی سے قبول کرنے یا مسترد کرنے کے حق سے محروم کر دیا تھا۔

مزید برآں، مغرب نے سائنس کو سوچ و فکر کی بنیاد بناتے ہوئے، کلیسا کو ایک اعلیٰ اختیار کے مقام سے ہٹا دیا جسے سننا اور اس کی تعمیل کرنا لازمی ہوا کرتا تھا۔ کائنات اور زندگی کی وضاحتوں میں جو کچھ بھی سائنس نے فراہم کیا تھا، اگرچہ ہر کسی کو اس سب کی سمجھ بوجھ اور ترکیب کی رسائی حاصل نہیں ہے، پھر بھی ہر ایک پر اس کو ماننا لازم کیا گیا۔ یہ اس سب کے باوجود ہے کہ یہ سائنسی علم ابھی محض مفروضہ جات ہیں جو کسی قطعی نتیجہ کے درجے تک نہیں پہنچے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی سائنسی کلیہ ثابت ہو جانے پر بھی اسے قطعی و حتمی علم نہیں گردانا جا سکتا، کیونکہ اس میں ہمیشہ اصلاح، ترمیم اور ارتقاء کا امکان ہوتا ہے۔ اس طرح مغربی فکر، کلیسا کی فرمانبرداری سے ہٹ کر سائنس کی اندھی تابعداری اور پیروی کی جانب مڑ گئی۔ مزید یہ کہ، ان میں سے کچھ سائنس کو مذہب کے طور پر ماننے لگے ہیں، جس کی مثال ارتقائی مذہب (Scientology) کو ماننے والا فرقہ ہے۔ سائنس کے پاس انسان کی وجہ تخلیق کے سوال سے متعلق کوئی حتمی جواب نہیں ہے۔ لہٰذا وہ سائنس جس نے مغرب کے انسان کو آزاد کرانا تھا، اسی نے اس کو جکڑ بندی میں ڈال دیا۔

دوم: سائنسی طریقہ کار تجربات پر مبنی ہوتا ہے۔اس میں صرف اس چیز پر تحقیق کرنا ممکن ہے جسے محسوس کیا جاسکتا ہو۔افکار یا تفکیر سے متعلق تحقیق کے دائرہ کار میں سائنس کی کوئی جگہ نہیں ہے۔جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مغرب سائنسی طریقہ کار کو تمام علوم اور تحقیقِ انسانی کے تمام شعبوں میں عمومی طور پر استعمال کرنے کا نقطہ نظر رکھتا ہے تو یہ بذاتِ خود سوچ و فکر کے بنیادی طریقہ کار کی مشابہت اور تقلید کی بناء پر ہے۔ایسے مغربی مفکرین موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ تجرباتی طریقہ کار (empirical method) کو تمام تر انسانی علوم پر لاگو نہیں کیا جاسکتا۔اُن کا ماننا ہے کہ انسانی جذبات واحساسات کا مطالعہ تجرباتی اعداد و شمار کے انداز میں نہیں کیا جاسکتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کوئی ایسی اشیائے محسوسہ نہیں ہیں کہ جسے سائنسی تجربات کا نشانہ بنایا جاسکے۔انسانوں کے باہمی تعلقات جو معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں اور ان کے مخصوص تغیرات، کا بھی لیباٹری تجربات کے ذریعے تجرباتی طریقہ کار کے مطابق مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔

سوئم: سائنسی طریقہ کار کے نتائج، قطعی نتائج نہیں ہیں، بلکہ یہ ظنی ہیں جن میں غلطی ممکن ہے۔سائنسی تحقیق میں، اس معاملہ کا مشاہدہ کیا گیا ہے اور یہ ایک متفقہ امر ہے۔اسی لئے، سائنسی علم کو ممکنہ اور ارتقاء پزیر علم کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔سائنسی سوچ و فکر ارتقاء، ترقی اور تبدیلی سے مشروط ہے۔لہٰذا، سائنسی تفکیر قطعی نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے سائنسی طریقہ انسانی سوچ و فکر کی بنیاد کے طور پر موزوں نہیں ہے کہ جس پر انسان اپنی زندگی کا فیصلہ کر سکے اور اسے زندگی کی بنیاد کے طور پر اپنا سکے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نہ تو مستحکم حقائق فراہم کرتا ہے اور نہ ہی اشیاء کے وجود کے ماخذ، ان کی خصوصیات اور ان کی ماہیئت کے بارے میں کوئی حتمی نتائج دیتا ہے۔حتیٰ کہ یہ سوچ و فکر کا ایک بنیادی طریقہ بھی فراہم نہیں کرتا۔اگر سائنسی طریقہ کار کو تفکیر کی بنیاد کے طور پر لیا جائے تو یہ حیات کا مفہوم کھوتے ہوئے وجودِ انسانی کے تصور کو کمزور کرنے کا باعث بنے گا۔اس کے نتیجے میں وجود کی روح و جوہر کو سمجھنے میں دھندلاہٹ ہوگی اور انسان کو خود اپنے آپ کو جاننے، اپنے مقصد اور زندگی میں اپنے کردار کے بارے میں الجھن پیدا ہو جائے گی۔یہ ایسا معاملہ ہے جو انسان کو محض ایک بے معنی وجود بناتے ہوئے اسے ہلا کر رکھ دیتا ہے۔مختصر یہ کہ اگرچہ سائنسی طریقہ کے فائدے تو ہیں اور انسان کو اس کی ضرورت بھی ہے لیکن یہ زندگی کے امور کے لیے سوچ و فکر کی بنیاد

بننے کے قابل نہیں ہے۔ یہ اس امر کے باوجود ہے کہ سائنس، تجرباتی علوم اور علم کے کچھ ایسے شعبوں کے لیے موزوں ہے جنہیں تجربہ گاہوں میں جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

وہ صحیح طریقہ جسے اشیاء اور معاملات کو جانچنے کے لیے ثالث بناتے ہوئے، سوچ و فکر کی بنیاد کے طور پر لینا چاہیے، سوچنے کا عقلی طریقہ کار (rational method of thinking) ہے۔ اگر عقلی طریقہ کو درست طور پر استعمال کیا جائے یعنی محسوس کردہ حقیقت کو حواس کے ذریعے دماغ کی طرف منتقل کرکے اسے سابقہ معلومات (جو کہ نہ تو گزشتہ آراء ہیں اور نہ ہی ان سے جُڑی آراء) سے جوڑا جائے، تو یہ حقیقت کے متعلق فہم دے گا کیونکہ یہ درست نتائج دیتا ہے۔ کچھ مغربی مفکرین کے دعوے کے برعکس، احساس و تفکیر لازم و ملزوم ہیں۔ سابقہ معلومات پہلے سے طے شدہ آراء نہیں ہوتیں، جیسا کہ بعض مغربی مفکرین دعویٰ کرتے ہیں۔ سابقہ معلومات تفکیر کا لازمی جزو ہیں۔ عقلی طریقہ، خواہ اس کی درست تعریف کی جائے یا نہیں، ہی وہ طریقہ ہے جس کی بنیاد پر انسان بحیثیت انسان سوچنے، معاملات کو پرکھنے، ان کے وجود، حقیقت اور خصوصیات کے ادراک کا عمل کرتا ہے۔ یہ سوچنے سمجھنے کا وہ طریقہ ہے جس تک تمام انسانوں کی رسائی ہے، جسے انسان اپنی تعلیمی قابلیت سے قطع نظر، اپنے فہم، ادراک اور اپنے فیصلوں میں خود بخود اختیار کر لیتے ہیں۔ عقلی طریقہ، علوم و تحقیق کے تمام شعبوں کے لئے موزوں ہے۔ اس طرح یہ قدرتی سائنس کے ساتھ ساتھ سماجی سائنس کے لیے بھی موزوں ہے۔ مزید یہ کہ اس کی دو امتیازی خصوصیات ہیں جو کہ سائنسی طریقہ کار میں نہیں پائی جاتیں۔ عقلی طریقہ نئی فکر پیدا کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے ممتاز ہے، جبکہ اس کے برعکس سائنسی طریقہ کار اپنی دریافتوں اور نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے محدود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی طریقہ موجود اشیاء (اشیائے محسوسہ) کے چھپے راز تو آشکار کرتا ہے مگر یہ غیر موجود اشیاء (اشیائے غیر محسوسہ) کے بارے میں کچھ بیان نہیں کرتا۔ یہ موجودہ عناصر پر ہی تشکیل دیا گیا ہے اور غیر موجود کے متعلق نتائج نہیں دیتا۔ لہٰذا، سائنسی طریقہ کار نئی فکر پیدا نہیں کرتا۔ جہاں تک عقلی طریقہ کار کی دوسری امتیازی خصوصیت ہے، یہ اشیاء کے وجود کے بارے میں قطعی نتائج فراہم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ سائنسی طریقہ کار کے برعکس، کہ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے احتمالی اور غیر حتمی ہوتا ہے، انسان کو اپنی زندگی کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے فیصلہ کن اور قطعی حقائق فراہم

کرتا ہے۔ سائنسی طریقہ کار انسان کو قیاس آرائیوں اور مفروضوں کے سوا کچھ نہیں دیتا، کہ جن میں غلطی کا امکان ہوتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوچ و فکر کے عقلی طریقہ کو آخر کس طرح بنیادی طریقۂ فکر کے طور پر اپنایا جا سکتا ہے، جب کہ یہ طے ہو چکا ہے کہ عقل تو ناقص، عاجز اور محدود ہے لہٰذا اسی لئے عقل یہ تعریف نہیں کر سکتی کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے اور اسی طرح حُسن کیا ہے اور قبیح کیا ہے؟ یا یہ سوال کہ آخر کس طرح عقلی طریقہ فکر ہی انسان کے لئے بنیادی تفکیر ہو سکتا ہے، جبکہ یہ کہا جاتا ہے کہ عقل کے علاوہ ایک اور طاقت ہے جو یہ طے کرتی ہے کہ انسان کے لئے کون سا عمل خیر لائے گا اور کون سا عمل نقصان کو روکتا ہے؟ تو ان سوالوں کا جواب یہ ہے کہ عقلی طریقہ فکر ہی اس پختہ یقین کی بنیاد ہے کہ واقعی ایک طاقت موجود ہے جو انسان کے لئے اچھا اور بُرا اور حُسن اور قبیح طے کرتی ہے۔ پس اس طرح، عقل تصدیق کرتی ہے کہ اس کائنات، انسان اور حیات کے پسِ پردہ ایک خالق موجود ہے جس نے یہ سب تخلیق کیا ہے اور وہ خالق اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے۔ عقل اس کی بھی تصدیق کرتی ہے کہ انسان ایک مخلوق ہے جو اپنے خالق کے ساتھ تعلقات کو منظم کرنے کے لیے ایک نظام بنانے سے عاجز ہے۔ اس لیے یقیناً خالق کی طرف سے ایک پیغام لانے والا (رسول) ہونا چاہئے جو خالق اور مخلوق کے باہمی ربط کو منظم کرنے کیلئے نظام مہیا کر سکے۔ عقل، مخلوق کے اس طرح ناقص ہونے کی بھی تصدیق کرتی ہے کہ وہ کوئی ایسا مکمل نظام تشکیل دے سکے جو کسی فرق، اختلاف یا تضاد سے پاک ہو اور اس نظام کی بنیاد پر انسان اپنی جبلتوں اور بنیادی ضروریات کی بہترین اور مؤثر طریقے سے تشفی اور تسکین کر سکے۔ پس اس طرح، اس نقطۂ نظر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لازمی طور پر پیغمبر کی طرف سے ایک ایسا نظام دیا جانا چاہیے جو کسی خامی اور تضاد سے پاک ہو اور جس میں خالق کی خوشنودی ہو۔ لہٰذا، عقلی طریقہ کو بنیادی طریقہ تفکیر بنانے میں اور اُس غیبی طاقت یعنی اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر ایمان لانے میں کوئی تضاد نہیں کہ وہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی ہیں جو خیر و شر اور حسن و قبح واضح کرتے ہوئے، نوعِ انسانی کے لئے زندگی کے امور کی تنظیم فراہم کرتے ہیں۔

فہرست

سوال وجواب: دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی کا قاعدہ

(عربی سے ترجمہ)

(ولید علمی کیلئے)

سوال:

السلام علیکم ہمارے شیخ! میرا ایک سوال ہے جو ان دو قاعدوں سے متعلق ہے، اَخفُّ الضررین "دو نقصانات میں سے چھوٹا نقصان" یا، اَھوَنُ الشَّرَّین "دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی"، ان قاعدوں کو اکثر داعی اور اسلامی تحریکوں کے کارکنان قانون سازی اور صدارتی انتخابات کے جواز کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان دو قاعدوں کو فقہاء تسلیم کرتے ہیں؟ نیز یہ کہ ان کے دلائل کیا ہیں؟ ان کے دلائل کا کیا جواب ہے؟ بارک اللہ بک۔

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اس قاعدے کے بارے میں ہم نے 29 اگست 2010 کو جواب دیا تھا، میں اسی جواب میں سے یہاں نقل کیے دیتا ہوں:

["اھون الشرین "یا"اخف الضررین" کا قاعدہ (دو برائیوں میں سے کم یا دو نقصانات میں سے تھوڑے کا قاعدہ)

یہ قاعدہ متعدد فقہاء کے نزدیک شرعی قاعدہ ہے، جو علماء اس کے قائل ہیں، ان کے نزدیک ان دونوں قاعدوں کے ایک ہی معنی ہیں، یعنی دو حرام کاموں میں سے کم حرمت والے کام کا جائز ہو جانا اور اس کا جواز ان کے نزدیک اس وقت ہے جب ایک مکلف شخص کے لیے ان میں سے کوئی ایک کام کرنا ناگزیر ہو جائے، اس کے لیے بیک وقت دونوں

کام چھوڑنا ممکن ہی نہ ہوں، گویاان دو میں سے کوئی ایک کام کرنے میں وہ مجبور ہو جائے یعنی دونوں سے بری ہونا ہر لحاظ سے اس کی وسعت اور طاقت سے خارج ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **(لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْساً إِلَّا وُسْعَهَا)"اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا"**(البقرۃ:286)۔ اور فرمایا: **(فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ)"تم سے جتنا تم سے ہو سکے اللہ سے تقویٰ اختیار کرو"**(التغابن:16)۔

یعنی جن حضرات کے نزدیک یہ قاعدہ قابل قبول ہے، ان کے نزدیک یہ اس وقت ہی لاگو ہو گا جب ایک مسلمان کے لیے دو حرام کاموں سے بچنا ناممکن ہو جائے، یعنی بیک وقت دونوں حراموں سے احتراز ممکن ہی نہ ہو، سوائے اس کے کہ کسی دوسرے بڑے حرام کا ارتکاب کرے، اِس قسم کی صورتحال میں ہی" اخف الضررین" (کم ترین نقصان) کو اختیار کیا جائے گا۔ ان علماء کے نزدیک کم ترین نقصان کا تعین اپنی خواہش سے نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس میں بھی شرعی احکامات کو ملحوظ رکھا جائے گا، چنانچہ دو جانوں کو بچانا ایک جان کی حفاظت سے زیادہ بہتر ہے، اسی طرح تین کا دو سے اور چار کا تین سے، اسی طرح جان کی حفاظت مال کی حفاظت پر مقدم ہے، دار الاسلام کی حفاظت بھی دین کی حفاظت میں داخل ہے، اور دین کی حفاظت جان و مال کی حفاظت سے زیادہ اہم ہے، اسی طرح جہاد اور امامت کبریٰ دونوں حفاظتِ دین میں داخل ہیں، یہ بالاترین اور تمام ضرورتوں میں اولین ضرورت ہیں۔ علامہ شاطبیؒ نے الموافقات میں کہا ہے: بلاشبہ لوگوں کی جانیں قابل احترام اور محفوظ ہیں، ان کو زندہ رکھنا مطلوب ہے، اس طرح کہ جب معاملہ ان کی زندگی کے بدلے مال چلے جانے کا ہو، یا ایسی صورتحال ہو کہ جان چلی جانے کے بدلے مال بچ جائے گا، ایسی صورت میں جانوں کی بقا بالاتر اور اولین ہو گی۔۔۔"

اس قاعدہ کی تطبیق کے لیے ان علماء نے چند مثالیں ذکر کی ہیں:

1-جب ماں کے لیے زچگی (بچے کی پیدائش) مشکل ہو جائے اور ماں اور بچے، دونوں کو بچانا ممکن نہ رہے، اور معاملہ فوری فیصلہ کا تقاضا کرے: کہ یا تو ماں کو بچایا جائے، جس سے بچے کی موت واقع ہو جائے گی، اور اگر بچے کو بچانے

کی کوشش کی جائے تو اس سے ماں کی موت واقع ہونے کا یقینی خدشہ ہو، اور اگر معاملے کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے اور ایک کو بچانے کے لیے دوسرے کی موت کو واقع نہ ہونے دیا جائے، یعنی ایک کی زندگی بچا کر دوسرے کی زندگی کو داؤ پر نہ لگایا جائے، تو دونوں کی موت واقع ہوگی۔ اس قسم کی صورت حال میں اسی قاعدہ یعنی "اھون الشرین" (برائیوں میں سے چھوٹی برائی) یا کم حرام یا کم فساد کو لیا جائے گا، اور وہ یہ ہے کہ جس کو بچانا مقصود ہے اس کو بچانے کی کوشش کی جائے گی، یعنی ماں، خواہ ماں کو بچاتے ہوئے بچے کی جان چلی جائے۔

2-ایک آدمی پانی میں ڈوبنے لگا ہے یا خدشہ ہے کہ اس کو کوئی اور شخص قتل کر ڈالے گا، یا سخت جسمانی تشدد کیے جانے یا اس کے کسی عضو کو شدید نقصان پہنچائے جانے کا سامنا کر رہا ہو، یا کسی عورت کے ساتھ زبردستی زنا کیے جانے کی صورتِ حال ہے، اور یہ تمام منکرات کسی مکلف شخص کی موجودگی میں ہو رہے ہیں جو ان منکرات سے روکنے کی قدرت رکھتا ہے، جبکہ اس کے ذمے فرض نماز کی ادائیگی بھی باقی ہے، جس کی ادائیگی کے لیے وقت بالکل تھوڑا رہ گیا ہو، اس صورت میں یا تو وہ ان حرام کاموں سے منع کر سکتا ہے جس صورت میں اس کی نماز کا وقت چلا جائے گا، یا پھر فرض نماز ادا کرتا ہے جس صورت میں حرام کام وجود پذیر ہوں گے، جبکہ اس کے پاس یہ دونوں کرنے کے لیے وقت نہیں۔ یہاں یہ قاعدہ منطبق ہوگا، اور کئی حرام کاموں کے درمیان موازنہ بھی شریعت کی طرف سے ہوگا، جہاں شریعت نے مذکورہ حرام افعال کو روکنا نماز کی ادائیگی سے زیادہ ضروری قرار دیا ہے، لیکن اگر دونوں کام کرنے کی قدرت ہو تو دونوں واجب ہوں گے۔

3-کچھ اور مثالیں بھی ہیں جن کو امام غزالی اور عزّالدین بن عبد السلام رحمہا اللہ نے ذکر کی ہیں، ان میں بھی اھون الشرین "دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی" کے قاعدے کا استعمال ظاہر ہوتا ہے، اور ان مثالوں میں احکامات کے درمیان موازنے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ عزالدین نے اپنی کتاب "قواعد الاحکام فی مصالح الانام" میں فرمایا ہے: "جب خالص قسم کے مفاسد اکٹھے ہو جائیں، تو اگر سارے کے سارے مفاسد کا خاتمہ ممکن ہو تو ہم ان کو ختم کریں گے، اگر سب کو ختم کرنا ممکن نہ ہو، تو ہم سب سے بڑا فساد پہلے ختم کریں گے، پھر جو اس کے بعد کے درجے کا ہو، پھر اس سے کم پھر اس سے کم۔ اس کے بعد انہوں نے چند مثالیں ذکر کی ہیں: مثلاً: کسی کو مسلمان کے قتل پر مجبور کیا

جائے،اس طور پر کہ اگر وہ اس کو قتل نہیں کرے گا تو اس کو قتل کر دیا جائے گا،اس صورت میں اس پر لازم ہو گا کہ وہ دوسرے مسلمان کے قتل کی برائی کو اپنے قتل ہونے پر صبر کے ذریعے ختم کرے، کیونکہ اس کا قتل ہونے پر صبر کسی اور کو قتل کرنے کے اقدام سے کم برا ہے۔۔۔"۔ تو یہ اس بات کی واضح مثال ہے کہ دو برائیوں یا دو حرام میں سے کم کو اختیار کیا جائے، کیونکہ وہ دونوں سے ایک ساتھ نہیں بچ سکتا، تاہم اگر وہ دونوں سے بچ سکتا ہے تو اس پر ایسا کرنا واجب ہو گا۔

ایک اور مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں: "اسی طرح اگر کسی کو قتل کی دھمکی کے ذریعے جھوٹی گواہی دینے پر مجبور کیا گیا، یا باطل فیصلہ کرنے پر مجبور کیا گیا، تو اگر جھوٹی گواہی یا باطل فیصلہ کسی دوسرے انسان کو قتل کرنے کے لیے ہو، یا اس کا عضو کاٹ دینے کے لیے ہو یا زنا کے جواز کے لیے ہو، ان تمام صورتوں میں اس کے لیے گواہی اور فیصلہ دینا جائز نہیں ہو گا۔ کیونکہ اپنے آپ کو قتل ہونے دینا اس سے بہتر ہے کہ وہ کسی دوسرے بے گناہ انسان کے قتل کا سبب بنے، یا بغیر کسی جرم کے اس کے عضو کو کاٹ دیے جانے کا سبب بنے، یا زنا کرنے کا سبب بنے۔۔۔"، یعنی جب صورتحال اس طرح ہو کہ یا تو اسے قتل کیا جائے گا یا پھر وہ دوسرے آدمی پر جھوٹی گواہی دے اور جھوٹی گواہی اس دوسرے آدمی کو قتل کرنے یا اس کا کوئی عضو کاٹ دینے یا اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کے لیے ہو تو اس کے لیے گواہی جائز نہ ہو گی بلکہ وہ اپنے قتل ہو جانے پر صبر کرے، کیونکہ اپنے آپ کو قتل کے سپرد کر دینا دوسرے مسلمان کے قتل سے اولیٰ اور بالاتر ہے۔

یعنی جس صورتحال میں دونوں حراموں سے بچنے یا دونوں سے رُکنے میں بے بسی کی صورتحال ہو، اسی صورتحال میں ہی اس دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی کے قاعدے کو لاگو کیا جاتا ہے۔

یہ اس قاعدہ کی تطبیق کی چند مثالیں ہیں، اور یہ ان علماء کے ذکر کردہ مثالوں کے مطابق ہیں جو اس قاعدہ کے قائل ہیں، لیکن سرکاری درباری مشائخ کی پیش کردہ مثالوں پر یہ قاعدہ پورا نہیں آتا یا وہ لوگ جو باطل اور گمراہ افکار کے ذریعے یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان شریعت کے احکامات سے ہٹ جائیں۔

بلا شبہ جو لوگ اس قاعدہ کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ایک حرام کی بجائے دوسرا حرام کیا جائے، اپنے اس فعل کا جواز یہ پیش کرتے ہیں کہ انہیں جیل بھیجے جانے کا خوف تھا، یا یہ کہ انہیں ان کی نوکری سے انھیں فارغ کر دیا جائے گا، تو یہ بات اس قاعدہ میں داخل نہیں۔

اسی طرح وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں حرام ہونے کے باجود ہم کفریہ حکومت میں شمولیت اختیار کرتے ہیں، یہ اس لیے کہ ہم فاجر و فاسق قسم کے لوگوں کے لیے میدان خالی نہیں چھوڑ سکتے، کیونکہ حکومت مکمل ان کے سپرد کرنا بڑا حرام ہے۔۔۔ تو یہ قاعدہ یہاں منطبق نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ ہم شراب خانہ کھول لیتے ہیں تاکہ اس کی کمائی مسلمانوں کے حصے میں آئے، بجائے یہ کہ کوئی کافر اسے کھولے اور وہ اس سے مال کمائے۔۔۔

اسی طرح یہ قاعدہ اس پر بھی جاری نہیں کیا جاسکتا کہ ایک آدمی دو حرام کاموں کا سامنا کرے اور وہ ان میں سے کم حرام کو اپنائے حالانکہ وہ دونوں سے بچنے کی قدرت رکھتا ہے، جیسے کہتے ہیں کہ فلاں کو منتخب کر لو، خواہ وہ سیکولر کافر یا فاسق ہی ہو، یا فلاں کی حمایت کرو، فلاں کی نہ کرو، کیونکہ پہلا ہمارے ساتھ تعاون کرتا ہے، دوسرا نہیں، اس طرح کی دیگر مثالیں۔ اس معاملے میں تو یہ کہا جائے گا کہ پیش آنے والے دونوں کام حرام ہیں، اس لیے نہ تو ایک سیکولر شخص کا انتخاب جائز ہے نہ ہی اس کو وکیل بنانا جائز ہے کہ ایک مسلمان کی طرف سے اس کو رائے دہی میں قائم مقام بنایا جائے، کیونکہ وہ اسلام کی پابندی نہیں کرتا، نیز وہ حرام کام کرے گا، جو وکیل بنانے والے کے لیے وہ کام خود کرنا بھی جائز نہیں، مثلاً وہ قانون سازی کرے گا، اور حرام قوانین پر دستخط کرے گا، نیز اس سے حرام کاموں کا مطالبہ کیا جائے گا اور وہ اس کو قبول بھی کرے گا، مختصراً وہ معروف سے روکے گا اور منکر کا حکم دے گا۔ چنانچہ اس قسم کے کسی بھی شخص کا انتخاب ناجائز ہوگا۔ کیونکہ دونوں کا انتخاب حرام ہے۔ جبکہ دونوں کے انتخاب کو چھوڑنے کی وسعت موجود ہے۔

"دو برائیوں میں سے چھوٹی برائی" کا قاعدہ اس طرح لاگو نہیں ہوگا کہ مسلمان دو حرام کاموں کا سامنا کر رہا ہو اور وہ ان دونوں سے بچ بھی سکتا ہو، لیکن وہ اپنی خواہش اور ہوس کے مطابق "چھوٹی برائی" اختیار کرتا ہے، اور اس گمان میں کم حرام کر بیٹھتا ہے کہ دونوں حراموں سے بچنے میں تو مشقت ہے۔۔۔! تو یہاں یہ قاعدہ جاری نہ ہوگا بلکہ شرعی

احکامات کے مطابق حتی الامکان تمام حرام کاموں سے بچنا واجب ہے۔ یہ کم ترین نقصان اور چھوٹی ترین برائی یا آسان ترین شر کے حوالے سے ایک مختصر گفتگو تھی۔] اقتباس ختم۔

آپ کا بھائی

عطاء بن خلیل ابو الرشتہ،

10 ربیع الاول 1442ھ

27 اکتوبر 2020ء

فہرست

سوال وجواب: جن معاملات پر شریعت خاموش ہے

(عربی سے ترجمہ)

(یحییٰ ابوزینہ کیلئے)

سوال:

السلام علیکم ورحمۃاللہ وبرکاتہٗ

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے،اس امانت کو اٹھانے میں آپ کی مدد فرمائے،اور قریب آتی اپنی نصرۃ سے آپ کی مدد فرمادے،ان شاءاللہ۔

سب سے پہلے تو میں معذرت کرتا ہوں،میرے سوالات بہت ہوتے ہیں،لیکن ہم نے حزب سے کھوج لگانا اور تحقیق کرنا ہی ہے،تاکہ ہماری فکر مضبوط،روشن اور صاف وشفاف ہوسکے۔

ایک سوال اُصولِ فقہ میں سے،اس موضوع،"جن معاملات میں شریعت خاموش ہے"،سے متعلق ہے۔

جیسا کہ ترمذی نے سلمان فارسی سے حدیث روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں، کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

«الحلال ما أحل الله في كتابه والحرام ما حرم الله في كتابه وما سكت عنه فهو مما عفا عنه»"حلال وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے،اور جس سے سکوت فرمایا تو وہ اُن اُمور میں سے ہے جس کو اُس نے معاف کردیا ہوا ہے"۔

کیا مذکورہ بالا حدیث میں ذکر شدہ سکوت کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گویا اس سے نزول قرآن کے وقت شریعت یعنی قانون سازی سے سکوت مراد ہے،یعنی شریعت کی تکمیل اور اس آیت کریمہ کے نازل ہونے سے

قبل،**(اَلیَوْمَ أکمَلتُ لَکُمْ دِیْنَکُم وَأَتْمَمْتُ عَلَیکُم نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الإِسلَامِ دِیْنًا)"آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا"**(المائدۃ:3)۔

تو یہ معلوم ہے کہ شریعت کے آنے سے پہلے کوئی شریعت نہیں،اور اصل یہ ہے کہ (شریعت کے آنے سے قبل)انسان پر کوئی شرعی تکلیف نہیں۔چنانچہ نزولِ قرآن کے وقت ایک مسلمان کو جاری شدہ احکامات دیے گئے اور شریعت نے اس وقت حلال یا حرام کا حکم بیان کر دیا۔ایک مسلمان ان احکامات پر اس وجہ سے عمل کرتا ہے کہ یہی اس کے لیے قانون ہیں اور انہی کے بارے میں اس سے پوچھ گچھ ہو گی۔

کچھ ایسے افعال واشیاء ہیں کہ شریعت مکمل ہو گئی مگر ان کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں کیا گیا۔یہی وہ اُمور ہیں جن کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد، **«وما سکت عنه فهو عفوٌ» "اور جس سے سکوت فرمایا تو وہ اُن اُمور میں سے ہے جس کو اُس نے معاف کر دیا ہوا ہے"**،سے اشارہ کیا ہے۔خاموش ہونے کا مطلب ہے کہ اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا گیا،عفو کے معنی ہیں؛ایسے اُمور پر مسلمان کا محاسبہ نہیں کیا جائے گا،خواہ یہ اُمور کسی کام کے کرنے سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ کرنے سے۔نبی ﷺ نے ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کرنے اور بحث کرنے سے منع کیا ہے جن کے بارے میں کوئی شرعی حکم نہ نازل کیا گیا ہو،تاکہ ایسے سوالات کی وجہ سے مسلمانوں پر اللہ کی طرف سے تنگی نہ ڈالی جائے۔

شریعت مکمل ہونے کے بعد اور **(اَلیَوْمَ أکمَلتُ لَکُمْ دِیْنَکُم وَأَتْمَمْتُ عَلَیکُم نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الإِسلَامِ دِیْنًا)"آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا"**(المائدۃ:3)،اس آیت کے نزول کے بعد:

اب ایسا کوئی فعل یا چیز باقی نہ رہی جس کے بارے میں کوئی حکم موجود نہ ہو(شریعت خاموش ہو)۔

کیونکہ شریعت نے تمام اشیاء وافعال کے بارے میں تفصیلاً احکامات دے کران کو گھیر لیا ہے۔

پس ایسی کوئی چیز یا فعل نہیں جس کے لیے کوئی حکم نہ بیان کیا گیا ہو، یا جس پر حکم نہ لگایا جاسکتا ہو۔

اب ایک مسلمان پر یہ لازم ہے کہ وہ ہر ایسے فعل کے حکم کے بارے میں سوال اور بحث کرے جس کو وہ کرنا چاہتا ہے، یہ بات مسلمانوں کی اُس حالت کے برعکس ہے جب وہ نزولِ قرآن کے زمانے میں تھے۔

ہمارے محبوب شیخ! کیا یہ فہم درست ہے؟ یہ جانتے ہوئے کہ میں اس کی تبنی کرتا ہوں جو کتاب اسلامی شخصیت جلد 3 میں موجود ہے اور اس سے انحراف نہیں کرتا، ان شاءاللہ۔

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

لگتا ایسا ہے کہ ایک پیراگراف کو سمجھنے میں آپ سے غلطی ہوگئی ہے، یعنی آپ نے جو کہا ہے:

(کچھ ایسے افعال واشیاء ہیں کہ شریعت مکمل ہوگئی مگر ان کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں کیا گیا، یہی وہ اُمور ہیں جن کی طرف رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد، **«وما سكت عنه فهو عفوٌ» " اور جس سے سکوت فرمایا تو وہ اُن اُمور میں سے ہے جس کو اُس نے معاف کر دیا ہوا ہے"**، سے اشارہ کیا ہے۔ خاموش ہونے کا مطلب ہے کہ اس کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا گیا، عفو کے معنی یعنی ایسے امور پر مسلمان کا محاسبہ نہیں کیا جائے گا، خواہ یہ کسی فعل کے کرنے سے تعلق رکھتے ہوں یا نہ کرنے سے۔ نبی ﷺ نے ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کرنے اور بحث کرنے سے منع کیا ہے جن کے بارے میں کوئی شرعی حکم نہ نازل کیا گیا ہو، تاکہ ایسے سوالات کی وجہ سے مسلمانوں پر اللہ کی طرف سے تنگی نہ ڈالی جائے۔)

اس جملے ،**«وما سكت عنه فهو عفوٌ» " اور جس سے سکوت فرمایا تو وہ اُن اُمور میں سے ہے جس کو اُس نے معاف کر دیا ہوا ہے"**، کا یہ مطلب نہیں کہ ان امور کا شرعی حکم نازل ہی نہیں کیا گیا، بلکہ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جس امر سے متعلق رسول اللہ ﷺ خاموش رہے وہ حلال ہے، یعنی اگر وہ کوئی شے ہے تو مُباح ہے، اگر وہ کوئی فعل ہے تو وہ فرض ہو گا یا مندوب ہو گا یا مباح یا مکروہ۔ ہم نے اس سے ملتے جلتے گزشتہ ایک سوال کے جواب میں 20 جمادی الثانی 1434ھ مطابق 5 مئی 2013 کو اس کو واضح کیا تھا۔ اس مسئلے سے متعلق اس جواب میں سے یہاں ذکر کیے دیتا ہوں:

[1-اس سے متعلقہ احادیث یہ ہیں:

ا۔ ایک روایت وہ ہے جس کو ترمذی نے سلمان فارسی رضی اللہ عنہُ روایت کیا ہے، فرماتے ہیں: ((سئل رسول الله ﷺ عن السمن، والجبن، والفراء، فقال: **«الْحَلَالُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ، وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَا عَنْهُ»**... وفي رواية أبي داود عن ابن عباس **«فَبَعَثَ اللَّهُ تَعَالَى نَبِيَّهُ، ﷺ وَأَنْزَلَ كِتَابَهُ، وَأَحَلَّ حَلَالَهُ، وَحَرَّمَ حَرَامَهُ، فَمَا أَحَلَّ فَهُوَ حَلَالٌ، وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عَفْوٌ))** "رسول اللہ ﷺ سے گھی، پنیر اور پوستین سے متعلق پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: **حلال وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے اور حرام وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام کیا ہے، اور جس پر سکوت فرمایا تو وہ اُن اُمور میں سے ہے جس کو اُس نے معاف کر دیا ہوا ہے"**۔ اور ابو داؤد کی ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہوئی روایت میں ہے: **« فَبَعَثَ اللَّهُ تَعَالَى نَبِيَّهُ، ﷺ وَأَنْزَلَ كِتَابَهُ، وَأَحَلَّ حَلَالَهُ، وَحَرَّمَ حَرَامَهُ، فَمَا أَحَلَّ فَهُوَ حَلَالٌ، وَمَا حَرَّمَ فَهُوَ حَرَامٌ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ عَفْوٌ»** "پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مبعوث کیا اور اپنی کتاب نازل کی اور حلال کو جائز کیا اور حرام کو ناجائز کیا، تو جس کو جائز کیا وہ حلال ہے اور جس کو ناجائز کیا وہ حرام ہے اور جس کے بارے میں خاموشی اختیار کی اس پر معافی ہے"۔

ب۔ بیہقی نے السُنَنُ الکُبریٰ میں ابو ثَعلبہ رضی اللہ عنہ سے حدیث روایت کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: **«إِنَّ اللهَ فَرَضَ فَرَائِضَ، فَلَا تُضَيِّعُوهَا، وَحَدَّ حُدُودًا، فَلَا تَعْتَدُوهَا، وَنَهَى عَنْ أَشْيَاءَ، فَلَا**

تَنْتَهِكُوهَا، وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ رُخْصَةً لَكُمْ، لَيْسَ بِنِسْيَانٍ، فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا»" اللہ تعالیٰ نے کچھ ذمہ داریاں عائد کی ہیں، ان کو ضائع نہ کرو، چند حدود طے کی ہوئی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو، کچھ چیزوں سے منع کیا ہے، ان کو پامال نہ کرو، اور کچھ چیزوں سے تمہیں رخصت اور چھوٹ دینے کے واسطے سکوت فرمایا ہے، کسی بھول چوک کی وجہ سے نہیں، سو ان کے بارے میں بحث میں نہ پڑو"۔

ج- ترمذی اور دار قُطنی نے علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں: لما نزلتهذه الآية **((وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾.** قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفِي كُلِّ عَامٍ؟ فَسَكَتَ، فَقَالُوا: أَفِي كُلِّ عَامٍ؟ قَالَ: **«لَا وَلَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ»**، فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى: **﴿يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تَسْئَلُوا عَنْ أَشْياءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ- ----الخ))** " جب یہ آیت **"اور لوگوں پر اللہ کیلئے بیت اللہ کا حج کرنا (فرض) ہے، جو اس کی استطاعت رکھتا ہو"**، نازل ہوئی تو صحابہ نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ ! کیا ہر سال (حج کرنا ہے)؟ آپ ﷺ نے سکوت فرمایا، انہوں نے دوبارہ پوچھا: یا رسول اللہ ! کیا ہر سال (حج فرض ہے)؟ آپ ﷺ نے فرمایا: **"نہیں، اور اگر میں "ہاں" کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا"**، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ قول نازل فرمایا: (**﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تَسأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُم**) **"اے ایمان والو! ایسی باتیں نہ پوچھو جو تم پر ظاہر کی جائیں تو تمہیں بری لگیں"۔**

دار قطنی کی ایک اور روایت میں ہے جس کو ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا گیا ہے، وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((**«يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ»** فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: فِي كُلِّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَأَعْرَضَ عَنْهُ، ثُمَّ عَادَ فَقَالَ: فِي كُلِّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَقَالَ: **«وَمَنِ الْقَائِلُ»**؟ قَالُوا: فُلَانٌ، قَالَ: **«وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَوْ وَجَبَتْ مَا أَطَقْتُمُوهَا وَلَوْ لَمْ تُطِيقُوهَا لَكَفَرْتُمْ»** فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى: **﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تَسْئَالُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُم﴾** الْآيَةَ.)) **"اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے"**، تو ایک آدمی نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ ! ہر سال فرض ہے؟ آپ ﷺ نے اس کی طرف سے چہرہ مبارک موڑ لیا، اس نے دوبارہ پوچھا: یا رسول اللہ ! کیا ہر سال فرض ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: **یہ کون ہے؟** تو

صحابہ نے جواباً عرض کیا: فلاں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: **اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر میں "ہاں" کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا، اور واجب ہو جاتا تو تم نہ کر پاتے، اور جب نہ کر پاتے ہوتے تو کفر اختیار کر لیتے"**۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ قول نازل فرمایا: **(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تَسْئَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُم) "اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں نہ پوچھو کہ اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں برا لگیں"**۔

2-ان آیات کے معنی و مطلب کے بیان سے پہلے چند ضروری باتوں کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا:

ا۔ "شئے" اور "فعل" کے درمیان فرق فقہی اور اُصولی بحث ہے، یہ لغوی مسئلہ نہیں، ورنہ لغوی اعتبار سے لفظ شے میں فعل بھی شامل ہو گا۔ اس طرح احکام شرعیہ کی فرض، واجب، مندوب، مباح، مکروہ، حرام، ممنوع، رخصت، عزیمت، شرط و سبب، مانع، صحیح، فاسد اور باطل کی طرف تقسیم۔۔۔ یہ سب فقہی و اُصولی اصطلاحات ہیں، اگر آپ اس زبان کی لغت (ڈکشنری) کھول کر ان کے معانی دیکھنے بیٹھ جائیں گے تو آپ کو اس کے فقہی معانی کہیں نہیں ملیں گے۔

ان فقہی و اُصولی اصطلاحات کی بنیاد رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور کے بعد ڈالی گئی، جیسے فاعل و مفعول وغیرہ کی نحو (عربی گرامر) کی اصطلاحات۔۔۔ تو اگر آپ ان کو زبان کی لغات (ڈکشنریوں) میں دیکھیں گے تو آپ کو ان کے معانی اصطلاحی معنوں سے مختلف ملیں گے۔

ب۔ لہٰذا، جب آپ رسول اللہ ﷺ یا صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی کوئی حدیث پڑھیں اور اس میں لفظ "شئے" یا لفظ "فعل" نظر آئے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ حدیث میں اس کے اصطلاحی معنی مراد ہیں، بلکہ آپ کو اس کا مطالعہ کرنا پڑے گا تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ اس کا صحیح مفہوم کہاں موجود ہے: یعنی اس حدیث میں یہ لغوی طور پر استعمال ہوا ہے یا یہ عرفِ عام میں مراد ہے، یا کوئی خاص اصطلاح مراد ہے یا اس سے کوئی شرعی حقیقت مراد ہے۔

ج۔ پس جب سوال مخصوص اور متعین الفاظ کے بارے میں ہو، پھر اُس کا جواب عام انداز سے دیا جائے، تو جس سوال کا جواب عام دیا گیا ہے، تو اس سوال کے موضوع میں بھی عموم ہوگا۔ اور جو الفاظ سوال میں وارد ہوئے ہوں، اُن الفاظ کے ساتھ جواب خاص نہ ہوگا۔ مثلاً ترمذی نے ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں: ((قِيلَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَتَتَوَضَّأُ مِنْ بِئْرِ بُضَاعَةَ...؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ : «**إِنَّ المَاءَ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ**»)) "کسی نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! کیا ہم بضاعہ کے کنویں سے وضو کر سکتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **بلاشبہ پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی**"۔

یہاں رسول اللہ ﷺ سے بضاعۃ کے کنویں کے بارے میں پوچھا گیا، لیکن جواب ایسے دیا گیا جو مستقل ایک حکم کو بیان کرتا ہے، جس میں بضاعہ کے کنویں کا ذکر موجود نہیں، یعنی فرمایا: «**اِنَّ المَاءَ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ**» "**پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی**"۔ حدیث کے الفاظ کے اندر موجود یہ عمومیت پانی سے طہارت حاصل کرنے پر صادق آتی ہے، خواہ پانی قبیلہ بضاعہ کے کنویں کا ہو یا کسی بھی کنویں کا، یہ نہ کہا جائے کہ حدیث میں موجود عمومیت کا تعلق بضاعہ کے کنویں کے ساتھ ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ جواب عام ہے اور اس کا موضوع بھی عام پانی ہے، جس کا اس جواب میں ذکر ہے، یعنی اس جواب کا موضوع سوال سے نہیں لیا گیا، یعنی یہ «**اِنَّ المَاءَ طَهُورٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ**» "**پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی**"، سے لیا گیا ہے، نہ کہ سوال میں موجود "قبیلہ بضاعہ کے کنویں" سے، یعنی اس جواب کا موضوع پانی سے طہارت حاصل کرنا ہے، نہ کہ بضاعہ کا کنواں۔

3-اب ہم آپ کے سوالات کے جواب کی طرف آتے ہیں:

1-ترمذی کی حدیث ہے کہ: رسول اللہ ﷺ سے گھی، پنیر اور پوستین (پشم) کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: «**الْحَلَالُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ، وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ، وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فَهُوَ مِمَّا عَفَا عَنْهُ**» "**حلال وہ ہے جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دیا ہے اور حرام وہ ہے جس کو**

اللہ نے اپنی کتاب میں حرام بتلایا ہے، اور جن باتوں پر سکوت اختیار کیا ہے تو وہ معاف شدہ امور میں سے ہیں"۔ ابو داؤد کی روایت میں ہے «**وَمَا سَكَتَ عَنْهُ فهو عَفْوٌ**» **"جس پر سکوت فرمایا ہے وہ معاف ہے"**۔

لہٰذا بعد میں آنے والے الفاظ (معطوف) «**...وَمَا سَكَتَ عَنْهُ**» **"۔۔۔اور جس پر خاموشی اختیار کی"**، کا تعلق اسی حصے سے ہے جو اس سے پہلے آیا (معطوف علیہ)، یعنی «**والحرام ما حرمه الله فی کتابه**» **" اور حرام وہ ہے جس کو اللہ نے اپنی کتاب میں حرام بتلایا ہے"**، یعنی جس سے سکوت کیا ہے وہ معاف شدہ حرام ہے، یعنی وہ حلال ہے۔

یہاں عمومیت اپنے موضوع میں ہے، لیکن چونکہ جواب اپنے سوال سے زیادہ عام ہے، یعنی گویا مستقل حکم بیان کیا گیا ہے، چنانچہ موضوع جواب سے لیا جائے گا، سوال سے نہیں۔ اسی وجہ سے اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کا حکم حلال کا ہو یا حرام کا، خواہ یہ عمومیت گھی، پنیر اور پوستین کی نسبت سے ہو یا کسی بھی ایسے معاملے کی نسبت سے جو حلال یا حرام میں آتا ہو، اور اصطلاحی معنی کے مطابق یہ "شئے" یا "عمل" کے تحت آنے والے ہر معاملے پر منطبق ہوتا ہے، پس اگر اس کو کسی شے پر لاگو کیا جائے تو یہاں حلال کے معنی "جائز" کے ہوں گے اور اگر فعل پر منطبق کیا جائے تو یہاں حلال کا مطلب ہے حرام نہ ہونا، یعنی فرض، مندوب، مباح یا مکروہ ہونا۔

ب- بیہقی نے ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں: «**...وَنَهَى عَنْ أَشْيَاءَ، فَلَا تَنْتَهِكُوهَا، وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ رُخْصَةً لَكُمْ، لَيْسَ بِنِسْيَانٍ، فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا**» **"اور کچھ چیزوں سے منع کیا ہے، پس ان کو پامال نہ کرو، اور کچھ چیزوں پر سکوت کیا ہے، یہ تمہارے لیے ایک چھوٹ ہے، کسی بھول کی وجہ سے نہیں، اس لیے ان جیسی چیزوں کے بارے میں زیادہ پوچھ گچھ نہ کرو"**۔

اس حدیث میں تین امور ہیں:

پہلا: «سکت عن اشیاء» **"کچھ چیزوں پر سکوت کیا ہے"**، یہاں "چیز" اپنے اصطلاحی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے، یعنی اس سے مراد وہ نہیں جو فعل کے علاوہ ہے، بلکہ اس میں فعل بھی شامل ہے، مثلاً یہ آیت کریمہ **(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ)"اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا کرو کہ اگر ان کے (حکم کے) بارے میں تمہیں بتایا جائے تو تمہیں برا لگے، اور اگر تم نزول قرآن کے وقت پوچھو تو بتا دیے جاؤ گے، اللہ تعالیٰ نے ایسی چیزیں معاف کر دی ہیں، اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے"**(المائدۃ:101)۔

جہاں تک "حج کے عمل" کے سوال کے متعلق ہے، تو وہ قرطبیؒ کی تفسیر میں درج ہے:

علی رضی اللہ عنہ سے ترمذی اور دار قطنی نے حدیث نقل کی ہے، فرماتے ہیں: "جب یہ آیت ﴿**وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا**﴾ "اور لوگوں پر اللہ کیلئے بیت اللہ کا حج کرنا (فرض) ہے، اس کیلئے جو استطاعت رکھتا ہو"، نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کیا: کیا ہر سال کریں؟، آپ ﷺ نے خاموشی اختیار کی، انھوں نے پھر پوچھا: کیا ہر سال کریں؟، تو آپ ﷺ نے فرمایا: **«لَا وَلَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ»" نہیں، اور اگر میں ہاں کہہ دیتا تو تم پر فرض ہو جاتا"**۔ اس پر اللہ جل شانہٗ نے یہ آیت کریمہ نازل کی، **(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا)"اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا کرو کہ اگر ان کے (حکم کے) بارے میں تمہیں بتایا جائے تو تمہارے لیے پریشانی پیدا ہو گی"**(المائدۃ:101)، آیت کے آخر تک۔

دار قطنی کی ایک اور روایت میں ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **(يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْحَجُّ)"اے لوگو، تم پر حج فرض کیا گیا ہے"**۔ ایک آدمی نے کھڑے ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! ہر سال فرض ہے؟ آپ ﷺ نے اس کی طرف سے اپنا چہرہ مبارک موڑ لیا، اس نے دوبارہ پوچھا: ہر سال

فرض ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «وَمَنِ الْقَائِلُ» "یہ کون ہے؟"، تو صحابہ نے جواباً عرض کیا: فلاں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: « وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَوْ وَجَبَتْ مَا أَطَقْتُمُوهَا وَلَوْ لَمْ تُطِيقُوهَا لَكَفَرْتُمْ» " اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر میں ہاں کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا، اور واجب ہو جاتا تو تم نہ کر سکتے، اور جب نہ کر سکتے ہوتے تو کفر اختیار کر لیتے"۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ قول نازل فرمایا: (يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لا تَسْئَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُم) "اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا کرو کہ اگر ان کے (حکم کے) بارے میں تمہیں بتایا جائے تو تمہارے لیے پریشانی پیدا ہو گی" (المائدۃ: 101)۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سوال حج کے بارے میں کیا گیا تھا، جبکہ جو آیت نازل ہوئی، اس میں حج کو شئے کہا گیا۔

دوسرا: اس حدیث میں «وسكت عن اشياء رخصةً لكم» "اور جن چیزوں پر سکوت اختیار کیا ان پر تمہارے لیے چھوٹ ہے"، جو «...وسكت» "سکوت اختیار کیا" کے الفاظ بعد میں معطوف کے طور پر آئے ہیں (یعنی واؤ حرف عطف کے ساتھ آیا ہے، عطف کا قانون یہ ہے کہ وہ قریب ترین معطوف علیہ پر عطف ہو گا) اور وہ معطوف علیہ یہاں یہ قول ہے: «ونهى عن اشياء فلا تنتهكوها» "اور کچھ چیزوں سے منع کیا ہے، پس ان کو پامال نہ کرو"، یعنی رخصت نہی جازم میں ہے، جو حرام سے متعلق ہے، اس پر «تنتهكوها» "ان کو پامال نہ کرو"، دلالت کرتا ہے، اب مطلب یہ بنتا ہے کہ جس چیز پر سکوت اختیار کیا ہے وہ رخصت ہے جو حرام کے قبیل سے ہو، یعنی سکوت کی وجہ سے وہ حلال ہے۔ اب جس معاملے کے بارے میں سوال کیا گیا تھا، اس کو اس پر کیسے منطبق کیا جائے گا، تو وہ اس طرح کہ اگر وہ اصطلاحی معنوں میں شئے ہے، تو حلال کے معنی یہاں اباحت کے ہوں گے، اور اگر وہ فعل یعنی اصطلاحی معنی کے اعتبار سے "عمل" کے قبیل میں سے ہو، تو حلال سے مراد وہ ہو گا جو حرام کے علاوہ ہے، یعنی فرض، مندوب، مباح، اور مکروہ۔

تیسرا: حدیث کے ان الفاظ «**فلا تبحثوا عنها**»"**ان کے متعلق پوچھ گچھ نہ کرو**"، کا تعلق بعد میں آنے والے الفاظ «**وسكت عن اشياء**»"**اور کچھ چیزوں پر سکوت اختیار کیا ہے**"، سے ہے، جو «**ونهى عن اشياء فلا تنتهكوها**»" **اور کچھ چیزوں سے منع کیا ہے، پس ان کو پامال نہ کرو**"، پر معطوف ہے، یعنی یہ حلال ہے تو ان کی حرمت تلاش مت کرو، یہ مطلب نہیں کہ ان کے احکامات یعنی فرض ہونا، مندوب یا مباح ہونے کی بحث نہ کرو۔۔۔ کیونکہ حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جس کے بارے میں خاموشی اختیار کی وہ حلال ہے، سو اس کی حرمت تلاش نہ کرو، کیونکہ یہ اندیشہ ہے کہ تمہارے سوالات کی وجہ سے وہ شئے حرام قرار دے دی جائے، جیسا کہ بخاری کی حدیث میں آیا ہے: سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «**إِنَّ أَعْظَمَ الْمُسْلِمِينَ جُرْمًا، مَنْ سَأَلَ عَنْ شَيْءٍ لَمْ يُحَرَّمْ، فَحُرِّمَ مِنْ أَجْلِ مَسْأَلَتِهِ**»" مسلمانوں میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جو کسی ایسی چیز کے بارے میں پوچھے جو حرام نہیں ہوئی، لیکن اس کے سوال کی وجہ سے حرام کی گئی"۔ (25 جمادی الثانی 1434ھ بمطابق 5 مئی 1434)]

گزشتہ تفصیل سے یہ واضح ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے سکوت کا مطلب حکم کی عدم موجودگی نہیں بلکہ اباحت ہے، اگر معاملہ شئے سے متعلق ہو، لیکن اگر معاملہ فعل کا ہو تو اس کا مطلب فرض، مندوب، مباح اور مکروہ ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کا سکوت ہی حکم شرعی کی بنیاد ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ جہاں تک سوال کرنے سے منع کرنے کی بات ہے تو یہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ سے متعلق تھا، یعنی رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس سے منع کیا گیا یعنی جب آپ ﷺ سے کوئی سوال کیا جائے اور آپ ﷺ جواب دیں یا خاموشی اختیار فرمائیں۔ اگر آپ ﷺ جواب دے دیں تو پھر واضح حکم ثابت ہوگا، اور اگر جواب نہ دیا اور سکوت فرمایا، تب بھی آپ ﷺ کے سکوت سے یہ حکم اخذ کیا جائے گا کہ وہ شئے یا فعل حلال ہے۔ اب جواب دینے یا خاموشی کے بعد اس کے بارے میں پھر سوال نہ کیا جائے، تو منع بار بار سوال کرنے اور دہرانے سے کیا گیا جبکہ رسول اللہ ﷺ جواب دے چکے ہوتے تھے یا سکوت فرمایا ہوتا تھا۔

اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ مسلمان کسی شئے یا فعل کا حکم معلوم کرنے کے لیے، جس کو وہ نہ جانتا ہو، سوال نہ کرے۔ اسلامی شخصیت جلد 3 کے باب "**شریعت کے آنے سے پہلے کوئی حکم نہیں**" میں آیا ہے:

(اور اس لیے بھی کہ قرآن و حدیث میں یہ ثابت ہو چکا ہے، کہ جب کسی حکم کا علم نہ ہو تو سوال کیا جائے، تو قف نہ کیا جائے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (**فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ**) "**اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھو**" (الانبیاء: 7)۔ "اور تیمم کی حدیث جس کو ابو داؤد نے جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے: ((**أَلاَ سَأَلُوا إِذْ لَمْ يَعْلَمُوا فَإِنَّمَا شِفَاءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ**)) "**جب انہیں نہیں پتہ تھا تو پوچھ کیوں نہیں لیا، جہالت کا علاج پوچھنا ہے**"۔ اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوا کہ اصل یہ نہیں کہ سوال کرنے اور پوچھنے سے رُکا جائے یا یہ سمجھا جائے کہ حکم نہیں۔ اس بنا پر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد اب حکم شریعت کا ہوگا اور یہ کہ شریعت آنے سے قبل کوئی حکم نہیں۔ چنانچہ اب حکم، شریعت کے آنے پر موقوف ہوگا، یعنی مسئلے کی شرعی دلیل پر حکم منحصر ہوگا، اس لیے حکم صرف دلیل کی بنیاد پر دیا جائے گا، بالکل جیسے شریعت کے آنے سے قبل کوئی حکم نہیں دیا جائے گا۔ لہٰذا اصل یہ ہے کہ کسی بھی مسئلے کا حکم شریعت سے ڈھونڈا جائے، یعنی اصل یہ ہے کہ کسی بھی معاملے میں شریعت سے حکم لینے کے لیے شرعی دلیل تلاش کی جائے گی۔)

اس بنا پر اب بات اس طرح ہے کہ جس سے منع کیا گیا وہ یہ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ نے ایک مسئلے کا حکم بیان کر دیا تو اس بیان کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ سوال در سوال کیا گیا۔ تو جب آپ ﷺ نے کہا کہ حج فرض ہے، تو آپ ﷺ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ کتنی مرتبہ فرض ہے، اور اگر کسی چیز کے بارے میں آپ ﷺ سے سوال کیا گیا اور آپ ﷺ نے اس کو کسی دوسری چیز کے ساتھ جوڑ دیا جس کا حکم معلوم تھا، یعنی یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چیز مباح ہے، تو اب اس کی پابندی ضروری ہے، یہ نہیں کہ پھر سوال کیا جائے (کہ کیا یہ فرض تو نہیں ہوگا؟) وغیرہ۔ یہ بات خاص طور پر نزولِ قرآن کے وقت کی تھی، کیونکہ اس طرح اپنے آپ پر سختی کرنا کہلایا جائے گا، کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا جائے گا، جیسا کہ اس آیتِ کریمہ میں آیا ہے:

(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ)

"اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا کرو کہ اگر ان کے (حکم کے) بارے میں تمہیں بتایا جائے تو تمہیں برا لگے، اور اگر تم نزولِ قرآن کے وقت پوچھو تو بتا دیے جاؤ گے، اللہ تعالیٰ نے ایسی چیزیں معاف کر دی ہیں، اور اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے" (المائدۃ: 101)۔

سنن ترمذی میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی **(وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا) "لوگوں پر اللہ کیلئے بیت اللہ کا حج کرنا (فرض) ہے، جو اس کی استطاعت رکھے"**، تو انہوں نے کہا: یہ ہر سال ہو گا یا رسول اللہ ﷺ؟ تو آپ ﷺ خاموش رہے۔ انھوں نے پھر پوچھا: ہر سال؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: **«لَا وَلَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ» "نہیں، اور اگر میں کہہ دیتا کہ ہاں تو ہر سال حج کرنا واجب ہو جاتا"**۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: **(يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ) "اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا کرو کہ اگر ان کے (حکم کے) بارے میں تمہیں بتایا جائے تو تمہیں برا لگے"**۔ ترمذی کہتے ہیں: اس باب میں ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے بھی روایت آئی ہے۔ ابو عیسیٰ (ترمذی) فرماتے ہیں: علی کی روایت اسی وجہ سے حسن غریب ہے۔

صحیح ابن حبان میں آیا ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ نے بتلایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ خطبہ دیا اور فرمایا: **«يا أيها الناس إن الله قد افترض عليكم الحج» "لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کر دیا ہے"**۔ تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور عرض کی: تو کیا یہ ہر سال ہو گا یا رسول اللہ ﷺ؟ آپ نے سکوت فرمایا یہاں تک اس آدمی نے تین مرتبہ دہرایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: **«لَوْ قُلْتُ: نَعَمْ، لَوَجَبَتْ، وَلَوْ وَجَبَتْ مَا قُمْتُمْ بِهَا، ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ، فَإِنَّمَا هَلَكَ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ، وَاخْتِلَافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ، فَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَاجْتَنِبُوهُ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ، فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»** "اگر میں "ہاں" کہہ دیتا تو واجب ہو جاتا، اور پھر تمہارے لیے ادا کرنا مشکل ہوتا، جب میں تمہیں

چھوڑوں تو مجھے بھی چھوڑ دیا کرو۔ کیونکہ تم سے قبل کی قومیں زیادہ سوالوں اور اپنے پیغمبروں کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہو گئیں، تو جب میں تمہیں کسی چیز سے روکوں تو اس سے اجتناب کرو، کسی چیز کا حکم دوں تو حسب استطاعت اس پر عمل کرو"۔اور یہ بھی بتایا کہ سورۃ مائدہ کی یہ آیت **(یا أیها الذین آمنوا لا تسألوا عن أشیاء إن تبد لکم تسؤکم)** **"اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں نہ پوچھا کرو کہ اگر ان کے (حکم کے) بارے میں تمہیں بتایا جائے تو تمہیں برا لگے"**،اسی بارے میں نازل ہوئی۔

اسی طرح کی روایت امام احمد نے اپنی مسند میں اور حاکم نے مستدرک میں،اسی طرح دار قطنی وغیرہ محدثین نے نقل کی ہے۔

چنانچہ مسلمان یہودیوں کی مانند نہ ہوں کہ جب ان سے کہا گیا کہ ایک گائے ذبح کرو، وہ گائے کی صفات و خصوصیات کے بارے میں سوالات کرنے لگے۔ چنانچہ گائے کی صفات کے حوالے سے ان پر سختی کی گئی،اگر وہ شروع میں کوئی بھی گائے ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتی۔

طبری کی تفسیر میں ہے:[اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مطلب کہ **(وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً قَالُوا أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ)**"جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے، تو انہوں نے کہا کہ آپ ہم سے مذاق کرتے ہو؟ تو موسیٰ نے کہا" میں ایسا جاہل بننے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں"(البقرۃ:67)۔

موسیٰ علیہ السلام کا ان کو یہ کہنا: **(إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذْبَحُوا بَقَرَةً)** **"اللہ تعالی تمھیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے"**،اس کی وجہ اس روایت میں ہے جو ہمیں محمد بن عبد الاعلیٰ نے معتمر بن سلیمان سے حدیث سنائی، سلیمان کہتے ہیں میں نے ایوب سے ،انہوں نے محمد بن سیرین سے ،انہوں نے عبیدہ سے سنا، عبیدہ کہتے ہیں : بنی اسرائیل کا ایک بانجھ آدمی تھا، جس کی کوئی اولاد نہیں تھی،اس کے رشتہ داروں میں سے ایک نے اسے قتل کر دیا، پھر اس کو اپنے قبیلے سے اٹھا کر کسی اور قبیلے میں پھینک آئے،راوی کہتا ہے : پھر ان قبیلوں کے درمیان اس پر جھگڑا ہوا اور

بات اسلحہ نکال لینے تک پہنچی، راوی کے بقول: ان میں سے عقل مند لوگوں نے کہا: ارے تمہارے اندر اللہ کا رسول (موسیٰ علیہ السلام) موجود ہیں اور تم آپس میں لڑتے ہو؟ بقول راوی: پھر وہ اللہ کے پیغمبرؑ کے پاس آئے، تو پیغمبرؑ نے کہا: ایک گائے ذبح کرو۔ انہوں نے کہا: آپ ہم سے مذاق تو نہیں کر رہے؟ نبی موسیٰ علیہ السلام نے کہا: **(أعوذ بالله أن أكون من الجاهلين * قالوا ادع لنا ربك يبين لنا ما هي قال إنه يقول إنها بقرة..... فذبحوها وما كادوا يفعلون)"میں جاہلوں میں سے ہو جانے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ اپنے رب سے یہ دعا کرو کہ وہ ہمارے لیے یہ تو بیان کرے کہ وہ (گائے) کیسی ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ ایک گائے ہے۔۔۔۔ پھر انہوں نے اس گائے کو ذبح کیا اور وہ بمشکل ہی ایسا کر پائے"** (البقرۃ: 71-67)۔ راوی کہتا ہے: پھر مقتول کو اس سے مارا گیا، پس مقتول نے اپنے قاتل کا نام بتایا، راوی کہتا ہے: وہ گائے انہیں سونے میں تول کر لینی پڑی، اگر وہ شروع میں کوئی بھی گائے لے لیتے تو کافی ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے بعد کسی قاتل کو وراثت نہیں ملی۔

راوی کہتا ہے: وہ لوگ جب انہیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا، کسی بھی گائے کو پکڑ کر ذبح کر دیتے تو درست ہوتا، لیکن انہوں نے خود اپنے آپ پر تشدد کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے لیے سختی پیدا کی، اور اگر وہ لوگ اس میں استثناء نہ کرتے یعنی یہ نہ کہتے کہ **(وإنا إن شاء الله لمهتدون)"اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ہدایت پالیں گے"** (البقرۃ: 70)، تو وہ ہرگز اس گائے تک نہ پہنچ پاتے۔]

اس سے ثابت ہوا کہ بے جا اور زیادہ سوالات کرنا منع ہے۔

امید ہے کہ اتنا آپ کے لیے کافی ہو گا، اور اللہ ہی بہترین علم و حکمت والا ہے۔

آپ کا بھائی

عطاء بن خلیل ابوالرَّشتہ

11 ربیع الاول 1443ھ

18 اکتوبر 2021ء

فہرست

سوال وجواب: عوامی آگہی سے جنم لیتی ہوئی رائے عامہ

(عربی سے ترجمہ)

(محمد علی بوعزیزی کیلئے)

سوال:

السلام وعلیکم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حال ہی میں، میں نے ایک بہترین شاب کا لکھا ہوا ایک مضمون پڑھا، جن کے بارے میں میرا خیال ہے کہ وہ حزب کے کلیدی اراکین میں سے ایک ہیں، مضمون میں وہ کہتے ہیں: "جب ہم اسلامی ریاست سے جُڑے ایک اسلامی سیاسی منصوبے کے بارے میں معقول رائے عامہ قائم کرنے کے قابل ہو جائیں اور اسلام کے منفرد سیاسی نظام کے لئے کم از کم کسی ایک ملک میں اہلِ قوت کی طرف سے تحفظ اور نصرۃ حاصل ہو جائے جو کہ غاصبوں اور ایجنٹوں سے اقتدار چھین لیں، تو تب اسلامی ریاست تاریخ کا رُخ موڑنے کے لئے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے گی"۔

جب میں نے اس مضمون کے حوالے سے ان سے پوچھا، تو اُن کا جواب تھا: "رائے عامہ نے ہمیں ابھی تک اپنی قیادت نہیں دی ہے، حالانکہ کچھ ممالک میں ہمارے لئے کافی ساکھ اور احترام پایا جاتا ہے۔ نیز، اکثر اہلِ نصرۃ اپنی قیادت کسی ایسے کو نہیں دیتے جن کی معاشرے میں مضبوط مقبولیت نہ ہو۔

میں اور میرے حلقۂ احباب کے دوسرے شباب اس رائے سے کافی مایوس ہوئے کیونکہ ہم اس خیال میں تھے کہ رائے عامہ تو موجود ہے۔ اور اُس ماحول کی وجہ سے جس میں میں رہتا ہوں، اور میرے رابطے کے لوگ، اور میرے ارد گرد کا حلقۂ احباب جس میں کچھ وکلاء بھی شامل ہیں، میں مکمل اطمینان اور اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ امت میں اسلام کی بنیاد پر حتمی تبدیلی کے بارے میں رائے عامہ پائی جاتی ہے۔

ہمیں، بطورِ حزب، اسلام (جسے ہم پیش بھی کر رہے ہوتے ہیں) کے بارے میں عوامی آگہی سے جڑی ایک رائے عامہ چاہئے اور ہم امت کو ایک ممکنہ اعلیٰ ترین مقام پر لانا چاہتے ہیں۔ تاہم، میری رائے میں ہمارے لئے نصرۃ کی طلب کے عمل کو شروع کرنے کے لئے یہ کوئی شرط نہیں ہے۔ چونکہ امت نے ہمیشہ ہی جذباتی وابستگی سے اسلام کا ہی انتخاب کیا ہے نہ کہ حزب النور، تیونس کی النہدۃ، اخوان یا اردگان کو منتخب کرتے ہوئے اُن کے تجویز کردہ اسلام پر بحث کی ہے۔ اور اگر امت نے عالمی نظام کے منظر نامے پر ہمیں پہلے پا لیا ہوتا تو یقیناً وہ اِن سے پہلے ہمارا چناؤ کرتی کیونکہ وہ ہم پر اعتماد کرتے ہیں اور حتیٰ کہ ہم سے چاہتے ہیں کہ ہم الیکشن میں حصہ لیں تاکہ وہ ہمیں منتخب کر سکیں۔ اسلام ویسے ہی اجنبی کے طور پر واپس آئے گا جیسا کہ یہ اپنے آغاز میں تھا۔ اور یہ کہنا کہ، اگر ہم امت کی اسلام کی آگہی، جو کہ ہم تجویز کر رہے ہیں، سے پہلے حکمرانی لے آئیں، تو وہ ہم سے بھی دُور ہو جائے گی یا یہ کہے گی: یہ وہ اسلام نہیں ہے جو ہمیں چاہیے، جو اگرچہ ایک غلط بیانیہ ہے اور ایسا نہیں ہو گا، کیونکہ امت نے عثمانی سلطنت کے آخری دور میں اُن نظریات کو، جو اسلام سے نہ تھے، محض اس بنا پر قبول کر لیا تھا کہ علمأ یا شیخ الاسلام نے ایسا کہا تھا اور امت نے اس کے معتبر ہونے کے جواز پر بحث نہیں کی تھی اور آج تک وہ اُنہی باتوں کو قبول کرتے ہیں جو ٹی وی پر معزز علمأ بیان کر دیتے ہیں۔ جب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور اقتدار سنبھالا، تو رائے عامہ اسلام کے ساتھ تھی، حتیٰ کہ ابھی تک قوانین مکمل بھی نہ ہوئے تھے۔

اور آج بھی جب طالبان اقتدار میں آئے، طالبان کے بارے میں الواقعہ ٹی وی چینل پر بہت سے موضوع زیرِ بحث آئے، جیسا کہ کیا ہمیں اُن سے یہ کہنا چاہئے کہ وہ خلافت کا اعلان کر دیں اور انہیں نصیحت کریں کہ اُن کا ماخذ صرف اسلام ہونا چاہئے اور یہ کہ وہ کسی عالمی نظام میں شمولیت نہ کریں وغیرہ وغیرہ۔۔۔ اُنہی شاب نے، جن کی رائے عامہ کے حوالے سے رائے کا میں اوپر حوالہ دے چکا ہوں، کہا کہ: طالبان کو اسلام کو ہی ماخذ کے طور پر لینا چاہئے اور ان کی حمایت امت سے ہونی چاہئے اور اُنہیں اپنے گردونواح پر گہری نظر رکھنی چاہئے اور یہ کہ اسے مسلمان ممالک کے مابین سرحدوں کو خاطر میں نہیں لانا چاہئے۔ یہ ایک درست اور اچھا بیان ہے، لیکن انہوں نے اپنی سمجھ کے مطابق رائے عامہ کا ذکر نہیں کیا۔

اگر حزب حکمرانی میں آتی ہے تو کیا کسی خاص رائے عامہ کی ضرورت ہو گی اور اگر کوئی اور خلافت کا اعلان کر دے تو کیا اس کی ضرورت نہ ہو گی؟

براہِ مہربانی ہماری رہنمائی فرمادیں۔ اللہ سبحانہ وتعالی آپ پر رحم کرے۔

جواب:

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کی نیک خواہشات کے بدلے میں اللہ سبحانہ وتعالی آپ پر کرم کرے اور اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

جہاں تک آپ کے سوال کے جواب کا تعلق ہے، تو عوامی بیداری سے جنم لیتی ہوئی رائے عامہ نصرۃ (مادی مدد) کی طلب کے لئے ایک شرط ہے۔ چنانچہ کسی بھی ملک میں جہاں یہ شرط پوری ہوتی ہو، تو اس ملک میں نصرۃ کی طلب کا عمل کیا جاتا ہے بشرطیکہ وہ ملک ریاست ہونے کے ضروری عناصر رکھتا ہو۔ لہٰذا اگر مجال (جہاں عملی طور پر دعوت کا کام ہو رہا ہو) میں سے کسی ملک میں رائے عامہ قائم ہو جائے تو اس میں نصرۃ کی طلب کی جاتی ہے اور ان دوسرے ممالک میں بھی جو ریاست بننے کے عناصر رکھتے ہوں یعنی کہ اگر مجال کے کسی بھی ملک میں رائے عامہ قائم ہو جائے جیسا کہ ذکر ہُوا ہے تو پھر ہر اُس ملک میں طلبِ نصرۃ فرض ہو جاتی ہے جو ریاست بننے کے ضروری اجزاء رکھتا ہو چاہے اُس ملک کو نقطۂ ارتکاز بنانا ہو یا دوسرے ملک سے ضم کرنا ہو۔

یہ رائے عامہ تو 1960 کی دہائی کے وسط میں ہی قائم ہو گئی تھی اور پھر حزب نے پورے مجال میں اُن ممالک کے حالات کے مطابق اور حزب کی قیادت کے لائحہ عمل کو دیکھتے ہوئے طلبِ نصرۃ کا عمل شروع کیا۔ اور ذیل میں آپ کی معلومات کے لئے کچھ متعلقہ معاملات کا ذکر کروں گا:

1۔ ہم نے 5 ربیع الثانی 1389 ہجری بمطابق 20 جون 1969 کو ایک سوال کے جواب میں کہا تھا:

[...1964 کے آغاز میں ہی، حزب کی ایک ولایہ، اردن میں حزب کو امت کا جواب مل گیا تھا،" اور ایک ہمسایہ ملک سے ضم ہونے کی تصدیق مل چکی تھی یعنی عوامی بیداری سے پیدا ہونے والی رائے عامہ کے ساتھ ساتھ ریاست کے اجزاء بھی حاصل ہو چکے تھے"۔ اور اس طرح مجموعی طور پر حزب کا یہی ردِ عمل تھا کہ یہ تمام مجال کیلئے تھا، اسی لئے حزب نے نصرۃ کے دو موضوعات (پہلا دعوت کے عمل کو ممکن بنانا اور دوسرا حکمرانی تک پہنچنا) میں سے ایک موضوع پر توجہ دی، یعنی حزب نے اپنے آپ کو حکمرانی/اقتدار تک پہنچنے کے لئے طلبِ نصرۃ تک محدود کر لیا اور اُس وقت سے ہی حزب طلبِ نصرۃ کا کام کر رہی ہے تاکہ حکمرانی تک پہنچا جا سکے۔ اقتدار کے لئے طلبِ نصرۃ ایک طریقہ ہے نہ کہ اسلوب، یعنی یہ ایک شرعی حکم ہے جس کی پابندی ضروری ہے اور یہ حالات و حقیقت کی مطابقت کا کوئی عمل نہیں ہے لہٰذا حزب، طلبِ نصرۃ میں ہی مصروف رہی ہے۔ تاہم طلبِ نصرۃ کے بہت سے عوامل ہیں اور پُر خطر بھی ہیں، ہر شاب ان کو ادا کرنے کے قابل نہیں اور حزب کے لئے یہ صحیح نہ ہو گا کہ ان کاموں کے لئے کسی بھی شاب کو مقرر کر دے لہٰذا یہ کام تمام شباب کے سپرد کرنا ممکن نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے قبائلی سرداروں یا ریاستوں کے سربراہوں سے اور ان وفود سے جو مکہ آتے تھے، اور ان اہلِ قوت سے جو بیت اللہ کی عبادت کے لئے آیا کرتے تھے، نصرۃ طلب کی، یعنی آپ ﷺ اہلِ قوت کے گروہ سے نصرۃ طلب کرتے رہے، وہ جن سے نصرۃ طلب کرنا قابل قدر تھا؛ مصعب بن عمیرؓ نے مدینہ کے سرداروں سے نصرۃ طلب کی اور انہوں نے یہ بات ان کے اہلِ قوت سے ہی کی۔ پھر انہوں نے انہیں ایک ایک کر کے اکٹھا کیا اور انہیں ایک گروہ کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے تاکہ وہ آپ ﷺ کی حمایت کریں اور آپ ﷺ کو مدینہ کی اتھارٹی دے دیں، اس دعوت کے پیغام کی حفاظت کریں اور اس کی حفاظت میں جان دینا بھی قبول کر لیں۔

یہ حقیقت ویسی ہی ہے جیسی حزب اپنی دعوت کے کام میں طلبِ نصرۃ کے لئے کر رہی ہے، حزب اُسی طرح اسے طلب کر رہی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا، اور جیسے مصعب بن عمیرؓ کر رہے تھے، چاہے وہ رسول اللہ ﷺ کی طرح کسی ایک گروہ سے طلبِ نصرہ ہو یا مصعبؓ کی طرح، جسے بہر حال رسول اللہ ﷺ کی منظوری حاصل تھی، جو

کہ اہلِ قوت افراد سے ایک ایک کر کے نصرۃ طلب کرنا اور پھر انہیں ایک گروہ کی صورت میں اکٹھا جمع کرنا، تاکہ وہ حقیقتاً نصرۃ فراہم کرنے کا کام کر سکیں۔۔]

2۔ ہم نے 12 محرم 1390 ہجری بمطابق 20 مارچ 1970 کو ایک سوال کے جواب میں یہ کہا تھا:

[نقطۂ ارتکاز وہ جگہ ہے جہاں سے ریاست قائم ہوتی ہے، یعنی وہ جگہ جہاں سے حزب اقتدار سنبھال لے... لیکن اگر وہ ریاست ہونے کے تمام عناصر نہ رکھتی ہو تو وہ نقطۂ ارتکاز کے لئے مناسب نہیں ہو گی، تاآنکہ کوئی اور جگہ ہو، یعنی کوئی اور ملک جو اس کا ساتھ دینے کیلئے تیار ہو، اگر اس میں ریاست قائم ہو جاتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ ریاست ہونے کے تمام اجزاء دونوں میں مل کر پائے جاتے ہوں یا ان میں سے کسی ایک میں...

... اردن نے حزب کی کسی کوشش کے بغیر خود سے ہی حمایت کا اعلان کیا تھا، اس لئے حزب کو اقتدار کے لئے اردن میں کام کرنا ہی تھا۔ پس حزب نے اردن میں کام شروع کر دیا اور اردن کے علاوہ بھی تاکہ نصرۃ کی طلب کرتے ہوئے طاقت حاصل کرنے کے لئے کافی مادی قوت مل سکے، خصوصاً اس وقت جب ایک دوسری جگہ سے حمایت کا جواب مل چکا تھا۔ لہٰذا اردن ایک نقطۂ ارتکاز ہو سکتا ہے اور عین ممکن ہے کہ اس میں اقتدار حاصل کر لیا جائے، کیونکہ نقطۂ ارتکاز کی شرائط پوری ہو چکی ہیں۔

... مدینہ نقطۂ ارتکاز کے لئے ایک موزوں جگہ تھی کیونکہ اس میں جزائر ممالک کے لئے ریاست ہونے کے عناصر موجود تھے اور حتیٰ کہ طائف بھی نقطۂ ارتکاز کے لئے موزوں جگہ تھی کیونکہ اس میں بھی جزائر ممالک کے لئے ریاست ہونے کے اجزاء موجود تھے...

طلبِ نصرۃ ایک بہت ہی مشکل اور انتہائی پُرخطر معاملہ ہے، کیونکہ اس کے لئے زبردست دلیری و جواں مردی، مستقل مزاجی اور غیر معمولی اسالیب، ان کے ساتھ صبر، برداشت اور بہترین بصیرت کی بھی ضرورت ہے...]

3۔ جہاں تک اصل قیادت کا تعلق ہے، موجودہ حالات میں ریاست کے قیام سے پہلے اسے حاصل کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ رائے عامہ سے ایک فکری قیادت تو حاصل ہو جاتی ہے مگر اصل قیادت تب تک حاصل نہیں ہوتی

جب تک امت اپنے معاملات خود اپنی نگرانی میں نہ لے لے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں تھا۔ جہاں تک آج کے دور کی بات ہے، تو مسلمان ممالک بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی حال میں استعماری کفار کے زیرِ حکمرانی ہیں۔ اسی لئے، رائے عامہ جو عوامی آگہی سے پُھوٹتی ہے، یعنی ایک فکری قیادت، اگر کسی بھی مجال علاقے میں حاصل ہو جاتی ہے اور اس میں ریاست کے عناصر پائے جاتے ہوں تو پھر نصرۃ طلب کرنا ایک فرض ہو جاتا ہے اور جہاں تک اصل قیادت کا تعلق ہے، یہ تب حاصل ہو گی جب ریاست قائم ہو گی جیسا کہ ہمارے حالات میں ہے جن میں ہم رہ رہے ہیں۔

4۔ آپ کے سوال سے ملتے جلتے ایک سوال کے جواب میں ان معاملات کی وضاحت ہم شائع کر چکے ہیں اور وہ جواب 20 ستمبر 2011 کو شائع ہوا تھا، اس میں ہے کہ:

[–عوامی بیداری:

☆ لفظ "الواعی" (آگہی) لفظ "وعی" سے اخذ کیا گیا ہے جس کے بارے میں لسان العرب میں ذکر ہے: (دل سے کسی چیز کا سیکھنا۔ مثال کے طور پر، اس نے وہ چیز اور تقریر اچھے طریقے سے سمجھ لی یعنی یاد کر لی، سمجھ لی اور قبول کر لی اور اس لیے وہ ایک آگاہ اور ہوشیار شخص ہے۔ اسی طرح، یہ شخص اس کی نسبت زیادہ باخبر ہے یعنی معاملات کو یاد رکھنے اور سمجھنے کا زیادہ فہم رکھتا ہے، اور یہ ایک حدیث میں بھی مروی ہے: «نَضَّر اللَّهُ امْرَأً سَمِعَ مَقالَتي فوَعاها، فرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعى مِنْ سامِعٍ» "اللہ تعالیٰ اس کو مزید خیر عطا کرے جس نے میری حدیث کو سُنا اور اسے یاد رکھا۔ بہت سے ایسے پیغام بردار ہیں جو سننے والوں سے زیادہ باشعور ہیں")۔

☆ "العام"، یہ شعور مجموعی طور پر معاملے کے تمام نمایاں پہلوؤں کے حوالے سے ہے۔ خلافت کے حوالے سے عوامی شعور کا مطلب صرف لفظ خلافت کا جزوی علم نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ کچھ نمایاں احکامات بھی معلوم ہوں جیسے یہ کہ خلافت فرض ہے، خلیفہ ایک ہی ہوتا ہے اور بیعت مرضی اور انتخاب سے ہی ہوتی ہے ...علاوہ ازیں کچھ قابلِ ذکر اختیارات جو خلیفہ کو حاصل ہوتے ہیں جیسا کہ اسلامی ریاست کے اندرونی و بیرونی معاملات کی دیکھ بھال کرنا... ہم یہاں "کچھ" احکامات کے معلوم ہونے کا ذکر کر رہے ہیں کیونکہ عوامی آگہی کا یہ مطلب نہیں

کہ تمام تفصیلات معلوم ہوں بلکہ کچھ علم ہی کافی ہے تاکہ وہ شخص خلافت کے بارے میں شعور حاصل کر سکے... اور اسی طرح کے دوسرے اور معاملات۔

۔عوامی آگہی، حقیقتاً دعوت کے مجال کے بیشتر علاقوں میں حاصل ہو چکی ہے، اور یہ بات بخوبی معلوم ہے، اگر یہ کسی ایک علاقے میں بھی محسوس کی جاتی، دعوت کے مراحل دوسرے علاقوں میں بھی ساتھ ہی آگے بڑھتے تاکہ ان علاقوں کے ساتھ ملا جائے جہاں یہ شعور حاصل ہو چکا ہے... یہاں تک کہ یہ اللہ کے حکم سے امت کے تمام پہلوؤں میں نہ اُجاگر ہو جائے۔

۔عوامی شعور کا اُجاگر ہونا طلبِ نصرۃ شروع کرنے کے لئے ایک شرط ہے... لیکن یہ شرط نہیں کہ یہ مجال کے تمام ممالک میں حاصل ہو۔ یہ عوامی شعور 1960 کے اوائل سے ہی مجال کے ایک سے زیادہ علاقوں میں حاصل ہو چکا تھا، چنانچہ حزب نے نصرۃ کی طلب شروع کر دی اور ہر اس ملک میں جہاں اس نے طلبِ نصرۃ کا فیصلہ کیا، حزب نے عوامی شعور سے جُڑی رائے عامہ کے حوالے سے اپنی دعوت میں کوششیں تیز کر دیں تاکہ دونوں امور کو ایک ساتھ حاصل کیا جا سکے۔

کسی جگہ پر رائے عامہ کے حاصل ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ علاقائی یا عالمی طاقتیں اسے متزلزل یا مضطرب نہیں کر سکتیں اور نہ ہی یہ مطلب ہے کہ وہ طاقتیں کوئی غلط افکار یا باطل خیالات نہ پھیلا سکیں گی...

ہم نے بہت سے مواقع پر ذکر کیا ہے، "عوامی شعور سے پُھوٹتی ہوئی رائے عامہ"... اور جب ہم صرف "رائے عامہ" کا ذکر کرتے ہیں یا صرف "عوامی آگہی" کا ذکر ہوتا ہے تو یہ بھی اس حقیقت کے تناظر میں صحیح ہے کہ رائے عامہ عوامی آگہی سے ہی جنم لیتی ہے۔ یہ دونوں ایک ہی سلسے کی کڑی ہیں اور سلسلے کے ایک جزؤ کا ذکر کیے بغیر دوسرے جزؤ کا ذکر کرنا درست ہے۔

۔ حزب نے ایک سے زیادہ علاقوں میں امت کی فکری قیادت سنبھال لی ہے،... لیکن چونکہ امت اپنے معاملات پر خود نگران نہیں، نہ ہی یہ اپنے فیصلے خود کرتی ہے بلکہ احکامات و فیصلے ان کے حکمرانوں کے آقاؤں کی طرف سے آتے

ہیں اور یہ حکمران تو ان کے ایجنٹ ہیں... یہ ضروری نہیں کہ فکری قیادت اصل قیادت کے ساتھ ہی حاصل ہو۔ اگر امت اپنے امور پر خود نگہبان ہوتی اور اس کے حکمران انہی میں سے ان کی پسند کے ہوتے تو اصل قیادت، فکری قیادت سے مطابقت رکھتی، اور اگر امت فکری طور پر آپ کو ہی قیادت دیتی ہے تو پھر اس کی اصل قیادت بھی آپ ہی ہوں گے ...

آج کے حالات میں، کچھ حد تک تو ممکن ہے کہ اصل قیادت حاصل ہو جائے لیکن زیادہ امکان یہی ہے کہ عوام میں اصل قیادت اللہ کے اذن سے حقیقی طور پر حکمرانی تک پہنچنے سے ہی حاصل ہو گی۔] اقتباس ختم ہوا۔

جیسا کہ آپ گزشتہ جواب میں دیکھ سکتے ہیں، کہ جو آپ نے ذکر کیا اور جو اس "بہترین" شاب نے بھی بیان کیا، وہ دونوں درست ہیں اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں، کیونکہ:

– بظاہر وہ بھائی عوام کی اصل قیادت لینے کے حوالے سے بات کر رہے تھے جیسا کہ آپ نے حوالہ دیا ہے، کیونکہ اُن بھائی نے کہا: (رائے عامہ نے ابھی ہمیں اپنی قیادت نہیں دی ہے)، ان کا مطلب اس حد تک رائے عامہ لینا ہے کہ لوگ اپنی اصل قیادت ہمیں دے دیں... اور یہ بہر حال ابھی حاصل نہیں ہوا... اصل قیادت کا حصول طلبِ نصرۃ کے لئے شرط نہیں ہے بلکہ اس کے لئے عوامی شعور سے پیدا ہونے والی رائے عامہ ہی کافی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم کسی ایک ولایہ (ملک) میں کثیر عوام کی طرف سے ہمارے افکار کا احترام کیا جائے، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔

– آپ ایسی رائے عامہ کی بات کر رہے ہیں جو عوامی شعور سے اُجاگر ہوتی ہے اور جس کے حاصل ہونے پر حزب اہلِ نصرۃ واہلِ قوت سے مدد مانگتی ہے، جو کہ بلاشک وشبہ درست معاملہ ہے...

میں اُمید کرتا ہوں کہ اتنی وضاحت کافی ہو گی۔

آپ کا بھائی

عطابن خلیل ابوالرشتہ

29صفر،1443ھ

6اکتوبر2021ء

فہرست

حزب التحریر/ارض مقدس- فلسطین: ریاست خلافت کے انہدام کے 101 سال مکمل ہونے کے موقع پر ہونے والی سرگرمیاں #خلافت_کو_قائم_کرو

#Time4Khilafah

حزب التحریر/ ملائیشیا: ریاست خلافت کے انہدام کے 101 سال مکمل ہونے کے موقع پر ہونے والی سرگرمیاں #خلافت_کو_قائم_کرو

#Time4Khilafah

حزب التحریر/ولایہ ترکی: ریاست خلافت کے انہدام کے 101 سال مکمل ہونے کے موقع پر ہونے والی سرگرمیاں #خلافت_کو_قائم_کرو

#Time4Khilafah

سوشل میڈیا معلومات

حزب التحریر مرکزی میڈیا آفس: http://hizb-uttahrir.info/

نصرۃ میگزین ماضی شمارہ جات (English):

http://www.hizb-uttahrir.info/en/index.php/literature/magazines/nussrah-magazine.html

نصرہ میگزین ماضی شمارہ جات (اردو):

http://hizb-uttahrir.info/ur/index.php/%D8%AF%DB%8C%DA%AF%D8%B1

ریاستِ خلافت کا آئین پر موبائل ایپ (Android):

https://play.google.com/store/apps/details?id=com.dustooralummah2

نُصرۃ

نصرۃ وہ حکمِ شرعی ہے کہ جس پر آج سیاسی طور پر امت مسلمہ کے مستقبل کا دار و مدار ہے کیونکہ نصرۃ کے ذریعے ہی اُس ریاستِ خلافت کا قیام عمل میں آئے گا جو ان غداریوں اور خیانتوں کے طویل سلسلے کا خاتمہ کرے گی جس کا امت کو سامنا ہے، جو اللہ کے نازل کردہ تمام تر احکامات کے ذریعے حکمرانی کا آغاز کرے گی، پوری امت مسلمہ کو ایک ریاست کے سائے تلے وحدت بخشے گی اور دعوت و جہاد کے ذریعے اسلام کے پیغام کو پوری دنیا تک لے جائے گی۔

نصرۃ کی دلیل ہمیں رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے ملتی ہے کہ جب مکہ کا معاشرہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے جامد ہو گیا تو اللہ سبحانہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے حکم دیا کہ آپ مختلف قبائل پر اپنے آپ کو پیش کر کے اِن کی حمایت و نصرت طلب کریں۔

پس آپ ﷺ نے ابو طالب کی وفات کے بعد مختلف عرب قبائل کی طرف رجوع کیا یہاں تک کہ مدینہ کے اوس و خزرج قبائل کے سرداروں نے اسلام قبول کرنے کے بعد آپ ﷺ کو نصرۃ دی اور اس نصرت کے نتیجے میں ہی بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد مدینہ میں پہلی اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ اور یوں وہ رہتی دنیا تک انصار کے لقب سے پہچانے گئے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان کی افواج میں موجود مخلص افسران اپنے انصاری بھائیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خلافت کی دعوت کے علمبرداروں کو نصرۃ فراہم کریں، اس کفریہ سرمایہ دارانہ جمہوری نظام کو اکھاڑ پھینکیں اور ایک خلیفۂ راشد کو قرآن وسنت کے نفاذ پر بیعت دیں اور رسول اللہ صلی اللہ وسلم کی اس بشارت کے پورا کریں کہ جب آپ ﷺ نے فرمایا: **«ثُمَّ تَكُونُ مُلْكًا جَبْرِيَّةً فَتَكُونُ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ تَكُونَ ثُمَّ يَرْفَعُهَا إِذَا شَاءَ أَنْ يَرْفَعَهَا ثُمَّ تَكُونُ خِلَافَةً عَلَى مِنْهَاجِ النُّبُوَّةِ»** " پھر ظالمانہ حکمرانی کا دور ہو گا اور اس وقت تک رہے گا جب تک اللہ چاہیں گے۔ پھر اللہ اس کو ختم فرمادیں گے جب وہ چاہیں گے۔ اس کے بعد نبوت کے نقش قدم پر خلافت قائم ہو گی " (مسند امام احمد)